५४६

९४१

४

مشاہیرِ عالم

اُن مہاپرشوں کے حالاتِ زندگی جو اپنے
پیچھے اس دُنیا میں خاص نقش اور اثر
چھوڑ گئے اور جو نوعِ انسان کے لئے مینارِ
روشنی کا کام دیتے ہیں۔

فوٹو لیتھو پریس دہلی،
میں پنڈت رام سرن داس نے طبع و شائع کیا

بارِ اوّل

مشاہیرِ عالم

سری کرشن جی

(از مولوی محمد حسین صاحب)

گرچہ جنسِ نیکواں ایں چرخ بسیار آورد
کم بزاید مادرے با ایں صفا دُرِّ یتیم

پیارے ہندوستان کی نسبت تنقید کے اصلی اور حقیقی معیار سے اغماض کر کے خواہ کچھ ہی نتیجہ کیوں نہ اخذ کیا جائے لیکن حق یہ ہے کہ یہ پوتر استھان اور رشیوں منیوں کی سرزمین خدائے تعالےٰ کے بے شمار فضلوں اور رحمتوں کی حقیقی اور جائز وارث رہی ہے اور اب بھی اس میں ان کے جذب کرنے کے جوہر موجود ہیں۔ بشرطیکہ اس کے لائق اور ہونہار فرزندوں کی مفید اور بابرکت زندگیوں کے قابل قدر نمونوں کو خضرِ راہ تسلیم کر کے نقل و حرکت کیجائے اس لئے ضرورت ہے کہ یہاں کے نیکوں اور قابلِ قدر انسانوں کے حالات کی تصویر کھینچی جائے اور برادرانِ وطن کو ان کی پاک سیرت اور زرّیں لائف سے مستفیذ ہونے کے لئے خوش نما پیرایہ میں ان کے قصص پیش کئے جائیں۔ یہی وہ وجہ ہے کہ ہم نے اس مقصد کے لئے ہندوستان جنت نشان کے بعض ایسے بزرگوں کے حالات کو تنقیدی نظر سے مع مفید اور نتیجہ خیز امور کے برادرانِ وطن کے آگے پیش کرنا ضروری سمجھا کہ جن کی عظمت ہزاروں برس سے کروڑں انسانوں کے

دلوں میں جاگزین ہے اور جس کے ذیل میں ہم سب سے پہلے سری کرشن جی کے مبارک حالات کو پیش کرنے کا دل میں بے حد جوش پاتے ہیں۔

پیارے کرشن کی زرّیں لائف میں اگرچہ خودغرضی سے بڑے بڑے سیاہ داغ ڈالے گئے ہیں اور خصوصاً ایسے خطرناک طور پر جس سے آپ کی مقدس شکل وصورت کو کوئی بے عیب اور نورانی یقین نہ کر سکے لیکن حق یہ ہے کہ پاک اور مطہر انسانوں کی شکلوں اور صورتوں کو خواہ کسی قدر کیوں نہ بگاڑا جائے اور سیاہ سے سیاہ پردے کیوں نہ حائل کئے جائیں حقیقت شناس اور غائر نظروں سے وہ چھپ ہی نہیں سکتے اور ایک وقت آجاتا ہے کہ تنقیدی معیار سے اُن کی زرّیں لائف بالکل پاک وصاف قرار دے دی جاتی ہے اور اُن کا اصلی اور حقیقی چہرہ ویسا ہی چمکتا اور دمکتا ہوا نظر آنے لگتا ہے جیسا کہ فی الحقیقت وہ ہوتا ہے اسی خیال سے ہم ذیل میں سری کرشن جی کی مطہر لائف کے چند نمونے مشتے از خروارے پیش کرتے ہیں ممکن ہے کہ کسی کو ان سے فائدہ پہنچ جائے اور ہماری محنت ٹھکانے لگے۔

پہلا واقعہ

ہر ایک واقف اس امر سے متفق ہے کہ آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے نانا مہاراج اگرسین سخت تر بے رحمی اور ظلم وستم کا تختۂ مشق بنائے گئے تھے اور بلا قصور تاج وتخت سے بے دخل کئے گئے تھے اور یہ سب ظلم وستم ڈھانے والا کرشن جی کا ماموں تھا جس کا نام کنس تھا۔ ظالم کنس نے نہ صرف اپنے بے گناہ والد ہی کی پگڑی اُتاری تھی بلکہ اپنے بہنوئی اور بہن (والدین کرشن جی) پر ظلم وستم کے پہاڑ اس بے رحمی اور سنگدلی سے توڑنے شروع کئے تھے اور اُن کی اولاد کے ناحق دنا روا قتل پر اس بے رحمی سے کمر باندھی تھی کہ اس کو خیال میں لانے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور دل میں ایک خاص قسم کا درد پیدا ہوتا ہے۔ خواہ بالغ اور عاقل انسان ظلم وستم کے تختۂ مشق بن کر ایک حد تک صبر کریں اور قدرت ان کو صبر تحمل اور برداشت کا عادی بنا دے مگر معصوم بچوں پر ناحق ظلم وستم انسان کو واقعی دوزخ کا سزاوار بناتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کنس کی کوئی تدبیر پیش نہ گئی اور خدائے کریم کو اپنے فضل وکرم سے محفوظ رکھ کر جس سے کام لینا تھا اُن کا وہ بال بیکا بھی نہ کر سکا۔

کنس نے اگرچہ کرشن جی کے والدین کو اُن کی کوئی اولاد زندہ نہ رکھنے کی غرض سے نظر بند کیا تھا مگر مشیتِ ایزدی نے چونکہ اُنہیں کو دنیا کی فلاح اور بہبودی کے لئے چنا تھا اس لئے کنس کی تمام کوششیں بیکار کرکے مہاراج بلرام اور کرشن جی کو صحیح و سلامت اور جیتا جاگتا رکھا اور سب سے پہلے آپ سے وہ کام لیا جو عین حکمت۔ عین مصلحت اور عین انصاف تھا۔ یعنے مہاراج اگرسین کا دوبارہ تخت شاہی پر بیٹھ کر عدل و انصاف سے رعیت کو سرفراز کرنا اور کنس کے خطرناک پنجۂ فولادی سے خلقِ خدا کا عموماً اور کرشن جی کے والدین کا خصوصاً رہائی پاکر زندگی کے دن امن چین سے پرماتما کی یاد میں گزارنا۔

دوسرا واقعہ

راجہ جراسندھ والی مگدھ نے کچھ عرصہ سے ایسا سر اُٹھایا تھا اور تقریباً ایک سو کشتری خاندان کے راجوں مہاراجوں کی آئے دن کی وقت بے وقت کی چڑھائی سے طاقتوں اور قوتوں کو اس طرح پامال کیا تھا کہ خدا کی پناہ یہ صاف ظاہر ہے کہ آئے دن کی چڑھائی اور وقت بے وقت کے حملے انسان کو پنپنے نہیں دیا کرتے۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ مذکور نے تقریباً ایک سو راجوں کو شکست دے کر قید کر لیا اور اس کے باعث غرور تکبر اور گھمنڈ اور خودسری میں یہاں تک ترقی کر گیا کہ جو جواہرات راجوں مہاراجوں کے تاجوں کی زینت کا موجب تھے اُنہیں نذریں لے کر بھی خوش نہیں ہوتے تھے۔

متھراپوری (مہاراج کرشن کی جائے پیدائش) پر جہاں کنس کے بعد کرشن جی کے نانا اور اصلی حقدار مہاراج اُگرسین کا عادلانہ راج تھا۔ اُس پر اُس نے متعدد دفعہ چڑھائی کی مگر تقدس مآب کرشن کے حُسنِ تدابیر سے ہر بار شکست فاش کھا کر حسرت اور یاس سے اس کو واپس ہونا پڑا لیکن جراسندھ اس قسم کی فطرت ہی نہیں رکھتا تھا کہ شکست کھا کر امن سے زندگی کے دن گزارے بلکہ وہ شکست کھانے کے بعد پھر جمعیت کو از سرِ نو مضبوط کر کے سینہ سپر ہو کر شکست کا قرار واقعی بدلا نکالنے کے لئے سخت کوشش کیا کرتا تھا چنانچہ جب اُس کی آخری شکست کے بعد دوبارہ آمد اور چڑھائی کا حال سری کرشن کو معلوم ہوا تو آپ نے آئے دن کے جھگڑوں کو مٹانے کے لئے یہ تدبیر سوچی کہ متھراپوری سے ہجرت کر کے کسی اور جگہ سکونت اختیار کرنا بندگانِ خدا کے کشت وخون سے بہت بہتر ہے اس لئے آپ نے

صرف امن پسندی کا قابلِ قدر نمونہ دکھلانے کے لئے اور لوگوں کو آئے دن کے قتل سے بچانے کے لئے متھرا کو خیر باد کہا اور اپنی قوم کو ایک اور مقام میں لا لبایا جس کا نام آپ نے دوارکا تجویز فرمایا اور یوں آئے دن کے جھگڑوں کو سرد کیا اور اپنی قوم کو امن و امان کا وارث بنایا جس سے آپ کی سچی امن پسندی اور جبلی شرارت کے پتلوں سے اعراض کرنے کا حال اظہر من الشمس ہوتا ہے۔ گویا آپ نے اپنے علمی نمونے سے یہ سبق دیا کہ جو خواہ مخواہ خلقِ خدا کو کسی خاص جگہ کی وجہ سے آئے دن قتل کرنے پر کمر باندھ لے اور ایک حد تک مقابلہ میں شکست فاش کھانے کے باوجود باز نہ آئے تو انسانیت یہی ہے کہ اس جگہ کو ہی چھوڑ دیا جائے اور یوں خلقِ خدا کو آئے دن کی ہلاکت سے محفوظ رکھے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کا وجود جیسا کہ ظالموں کی سرکوبی کے لئے تھا ویسا ہی امن و امان کا سبق دینے اور سچی راحت اور سرور کا وارث کرنے والا بھی۔

بہرکیف جراسندھ کے ذمہ یہ بڑا ذہنی قصور ہے کہ اس نے ایک ایسی قوم کو جو اس سے پہلے ایک خطرناک ظالم سے بہت سا دکھ برداشت کر چکی تھی ناحق و ناروا تباہ و ہلاک کرنے پر کمر باندھی مگر قدرت نے اس کو ایک سچے ریفارمر اور سچے ہادی کی بدولت اپنے منصوبے میں ناکام و نامراد رکھا۔ بلکہ اس کے علاوہ اپنی دوسری حرکتوں کا بھی اس کو خمیازہ بھگتنا پڑا۔ یعنی جن راجوں کو اسی طرح قید کیا تھا ان کو رہائی دلانے کے لئے سری کرشن کے دل میں جوش پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ معہ ارجن اور بھیم کے صرف اسی اہم کام کے لئے اس کے پاس تشریف لے گئے اور جراسندھ کے سامنے جا کر اپنے آنے کی اصل غرض کو بڑی بہادری اور دلیری سے یوں بیان فرمایا کہ "ہم لوگ دھارک ہیں۔ دھرم ہمارا جیون (زندگی) ہے۔ دھرم کی رکھشا کرنا ہمارا فرض ہے۔ پرمیشور نے ہمیں یہ سامرتھ (طاقت) دی ہے کہ دھرم کی رکھشا کر سکیں۔ پس یہ سامرتھ رکھتے ہوئے آپ کو آپ کے اعمال کی سزا نہ دینا دراصل اپنے آپ کو گناہ کے سمندر میں غرق کرنا ہے۔ ظالموں کا سر کچلنا اور مظلوموں کی مدد کرنا ہر ایک کشتری کا پرم دھرم ہے اور اسی نیت سے ہم آپ کے پاس آئے ہیں کہ آپ کو سمجھائیں کہ آپ کشتریوں پر ظلم نہ کریں اور قیدیوں کو رہا کر دیں ورنہ یاد رکھیں کہ

ہم کو حق سے اس قدر پیار ہے کہ ہم حق کے لئے مرنے سے ہرگز نہیں ڈرتے کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ مظلوموں کی مدد کے لئے لڑنا دراصل دھرم کی لڑائی ہے اور دھرم کی لڑائی میں جو مرتا ہے وہ سیدھا سورگ (بہشت) کو جاتا ہے پھر فرمایا کہ اگر آپ اپنے آپ کو دنیا میں مہابلی سمجھتے ہیں تو بڑی غلطی کرتے ہیں کیونکہ اس سنسار میں ابھمان (غرور) کرنے والا انسان ضرور خسران مبیں کا وارث بنتا ہے۔ ایسے ہی اس دنیا میں بڑے بڑے مہابلی موجود ہیں۔ پس اے راجن قیدی کے طریقے کو چھوڑ دے اور خدا کا خوف کر اور اُن قیدیوں کو رہا کر دے ورنہ ہم سے کشتی کر کے اپنی طاقت وقوت کو آزمالے تاکہ حق کا بول بالا اور باطل کا مُنہ کالا ہو" باوجود اس شائستگی سے سمجھانے کے جراسندھ باز نہ آیا اور ایک حقیقی خیرخواہ کی نصیحت سے مُنہ موڑ کر کرشن جی اور ارجن کو تو کسی شمار وقطار میں نہ سمجھا اس لئے ان سے کشتی کرنے کو اپنی ذلت کا موجب قرار دے کر بھیم کو اپنا مدِ مقابل سمجھ کر لڑنے مرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ بھیم کے ہاتھوں اپنے بے جا غرور کے باعث ہلاک ہوا اور مہاراج کرشن نے سب سے پہلے قلعہ کا دروازہ کھول کر اور رحمت کے فرشتہ کی صورت میں قدم رنجہ فرما کر اُن سب راجوں مہاراجوں کو قید سے رہائی دی جو جراسندھ کے ظلم وستم کا تختۂ مشق بنے ہوئے تھے اور اس کے بعد جراسندھ کے بیٹے کو راج تلک دے کر ثابت کر دیا کہ دراصل آپ کا جراسندھ سے بیر محض بنی نوع انسان کی خیرخواہی کے لئے تھا اور وہ جراسندھ کے خاندان کے بھی دل سے خیرخواہ تھے۔

تیسرا واقعہ آپ کی زندگی کے واقعات میں سے ایک قابلِ قدر واقعہ پراک جیوتش دارالخلافت کامروپ (آسام) کا ہے جس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ وہاں کے راجہ مسمی نرک نے اس قدر سر اُٹھایا تھا اور ایسی شرارت اور ظلم وستم پر کمر باندھی تھی کہ جس کی عورت کے حُسن وجمال کا چرچا سنتا یا دیکھتا اور ایسے ہی جو کسی کی اچھی چیز اُس کے ملاحظہ میں آتی زبردستی اُس سے چھین لیتا۔ ایک عرصہ تک اس قسم کے ظلم وستم برداشت کرنے کے بعد اس علاقہ کے لوگ مہاراج کرشن کی جناب میں فریادی ہوئے۔ آپ نے نرک پر چڑھائی کی اور پہلے اُس کو ان حرکاتِ ناشائستہ سے منع فرمایا۔ جب وہ باز نہ آیا بلکہ ناصح مشفق کی نصیحتوں سے

منہ موڑا اور اپنے بل بوتے کا گھمنڈ ظاہر کیا تو آخر لڑائی تک نوبت پہنچی اور اپنے کیفرِ کردار کو پہنچکر نرک پوری کو سدھارا اور مہاراج نے سیدھا اُس کے محل کی طرف رُخ کیا اور جبرِ دلتعدی وظلم وستم سے جس قدر عورتیں وہاں محصور تھیں اُن سب کو رہائی بخشی۔ چنانچہ اُن عورتوں کی تعداد سولہ ہزار کے قریب وشنو پران کے ادھیائے ۲۹ میں بیان کی گئی ہے۔

اس سے آپ کی اعلیٰ ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے اور صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لڑائی محض دوسروں کی فلاح اور بہبودی کی خاطر کی گئی تھی۔ اپنا کوئی ذاتی فائدہ آپ کے مدِنظر ہرگز نہ تھا۔

چوتھا واقعہ

آپ کی مبارک زندگی کا ایک واقعہ راجہ پونڈر والیِ بنارس سے لڑائی کا بھی ہے جس نے کرشن جی سے خواہ مخواہ اس درجہ کا حسد و کینہ شروع کیا تھا کہ اوّل تو آپ کی جائز عزت وعظمت کو پامال کرنے اور لوگوں میں آپ کا وقار کم کرنے کے لئے جو لقب تھا لینے واسدیو وہ اختیار کیا تھا۔ دوسرے حسد اور بغض سے بعض گستاخانہ پیغام بھی اکثر بھیجتا رہا تھا۔ تیسرے آپ کو جعل ساز۔ مکار وغیرہ بھی بیان کرتا رہا مگر آپ نے اپنے نفس کے خاطر چڑھائی کرنے کا کبھی ارادہ نہیں کیا اور ایسے معاملات میں قابل قدر حلم اور صبر کا نمونہ دکھایا لیکن حسد بُری بلا ہوتی ہے۔ پونڈر نے آپ کے اخلاق فاضلہ سے سبق حاصل نہ کیا بلکہ بجائے سبق حاصل کرنے کے آپ کے کیلاش یاترا پر جانے کے بعد چوروں کی طرح دوارکا پر چڑھائی کر کے شبخون مارا آخر صبر کی حد ہوتی ہے۔ اس لئے مجبوراً آپ کو اس کی سرکوبی کے لئے نقل وحرکت کرنی پڑی اور راجہ پونڈر نے ناحق حسد وغرور وتکبر اور نخوت میں گرفتار ہونے کا خمیازہ بھگتا اور یوں ثابت ہوا کہ دراصل نیکوں اور پارساؤں سے ناحق حسد وبغض کرنا اور ان کے ستانے اور تباہ کرنے پر کمر باندھنا انسان کو قعرِ مذلت اور رسوائی وخواری کا وارث بناتا ہے۔

پانچواں واقعہ

آپ کی مقدس زندگی کا سب سے بڑا واقعہ مہابھارت کا واقعہ ہے جس کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ اس خونخوار اور بھارت ورش میں تباہی اور بربادی کی بادِ سموم پھیلانے والی لڑائی کے بانی مبانی سری کرشن ہی تھے۔ یعنی آپ ہی

نے ارجن وغیرہ کو لڑنے کے لئے اُکسایا تھا۔ اگر آپ کی طرف سے لڑنے کی تحریک نہ ہوتی تو یہ خونخوار جنگ ہرگز وقوع میں نہ آتی۔

لیکن حق یہ ہے کہ آپ نے اس لڑائی سے باز رکھنے کے لئے طرفین کو جس قدر سمجھایا اور جس قدر کوشش بذات خود کی وہ اس قدر وزن دار ہے کہ آپ پر اس کا الزام لگانا خطرناک غلطی ہے۔

واقف حضرات اس امر سے کافی آگاہی رکھتے ہیں کہ پانڈوؤں کے ساتھ کوروؤں نے جو طریقہ اور رویہ اختیار کیا تھا وہ واقعی خطرناک ظلم کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ سب سے پہلے جو حرکت کوروں نے کی یعنے لاکھ کے محل میں آگ لگا کر پانڈوؤں کو زندہ جلا دینا۔ وہ ایسی ناقابل برداشت ہے کہ اُس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے وہ تھوڑا ہے۔ ایسے ہی اُس کے بعد کے واقعات اور پانڈوؤں کی ترقی جاہ و مال و منال اور شان و شوکت کو دیکھ کر کوروؤں کا آتش حسد میں جل کر مہاراج یدھشٹر کو چال بازی سے جوا کھیلنے پر آمادہ کرنا ان کی دوسری نازیبا حرکت تھی۔ پھر شریمتی دروپدی جی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر سبھا میں لانا تیسری سراسر شرارت تھی۔ ایسے ہی بارہ برس کے لئے بن باس کا فتویٰ پاس کرانا اور اُس میں خطرناک اور ناقابل برداشت شرائط مقرر کرنا چوتھی شرارت تھی۔ بالآخر پانڈوؤں کے ہر ایک شرط کے ماننے اور بجا لانے کے باوجود اُن کو اُن کا حصہ نہ دینا نہایت ہی ظالمانہ حرکت تھی جو کوروؤں سے ظہور میں آئی۔

مقدس کرشن نے طرفین کی خیر خواہی میں ہرگز فرق نہیں کیا۔ ہر طرح سے دونوں کو سمجھایا چنانچہ آپ کی مبارک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ پانڈو صرف پانچ گاؤں لے کر اپنا گزارہ کرنے پر راضی ہو گئے لیکن کورو اپنی چال سے نہ چوکے۔ دریودھن کے سر پر کچھ ایسا حسد۔ کینہ اور خود پسندی کا بھوت سوار تھا کہ وہ راضی نہ ہوا۔ کرشن جی نے اُس کو سمجھانے کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ خود سفیر بن کر گئے۔ دھرت راشٹر مہاراج اور گندھاری جی (والدین دریودھن) کو سمجھایا۔ دوسرے بزرگوں کے ذریعہ دریودھن کو مآل پر نگاہ رکھنے کی طرف توجہ دلائی مگر وہ نہ مانا پر نہ مانا۔ بلکہ خود کرشن جی کے خلاف ایسے خیالات ظاہر کرنے لگا جو ہر صورت میں

قابلِ نفرت اور لائقِ ملامت تھے۔ جس پر بزرگوں کو اُس کی پست خیالی پر بہت ہی افسوس ہوا اور بعض نے اس کی خبر بھی لی۔

واقعات پر جہاں تک نظرِ غائر ڈال کر انصافاً دیکھا جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سری کرشن کو سخت تر مجبور ہونے کی حالت میں بے انصافوں اور ظالموں سے مقابلہ کرنے کے لئے ہدایت کرنی پڑی اور یوں مہابھارت کی خونخوار جنگ نے جہاں کوروں کا تخم صفحۂ دہر سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا وہاں پانڈوں کو بھی خون کے آنسو رلانے سے مستثنیٰ نہ رکھا جس کا اصل پوچھو تو سارا گناہ انصاف کے سپاہ دشمن دریودھن کی گردن پر ہے جس نے حق اور راستی سے انکار کیا اور حقیقی ناصحوں اور سچے خیر خواہوں کی نصیحت پر کان نہ دھرے۔

کرشن مہاراج کی پوتر لائف کی داستان اگرچہ بہت لمبی ہے جس میں پہلا نمبر ظالم کنس کے مارنے کا ہے تو آخری مہابھارت کی گھور سنگرام (خونخوار لڑائی) کا لیکن اس جنگ سے پہلے اور بعد کے واقعات اور خصوصاً دھرم راج مہاراج یدھشٹر کے آگے پند و نصائح کے انمول رتنوں اور بے بہا خزانوں کے جو دریا مہاراج نے بہائے تھے اور اس کو عسر و یسر (تنگی اور فراغبالی) میں ایک خالص النخاص اسٹیج پر قائم رہنے کے لئے جس قدر قابلِ قدر کوشش کی ہے وہ واقعی اس لائق ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اس کو اپنی زندگی کے لئے مفید اور بابرکت یقین کر کے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر عمل درآمد کرنے پر مستعد ہو جائے۔

تقدس مآب کرشن کے پوتر ارشادات اور منوہر بچنوں ہی سے دراصل مہاراج یدھشٹر دھرم راج بن گئے تھے۔ اگر کرشن جی کا مبارک اور فائدہ بخش وجود پانڈوں کا پشتی بان نہ ہوتا گو پہلے مرحلے میں نہ سہی تو دوسرے میں تو ضرور ہے کہ پانڈو عدم کے راہرو بن جاتے۔ نہ تو اُن کی طاقت ہی کام آتی اور نہ کوئی تدبیر ہی اُن کو فائدہ پہنچاتی۔ یہ تو سچ ہے کہ دُنیا میں طاقت قوت اور حُسنِ تدبیر انسان کے لئے بہترین مددگار ہیں لیکن حق یہ ہے کہ بغیر قابل قدر اور غیور خیر خواہوں کے فلاح اور سلامتی کا راستہ بسا اوقات مسدود ہی رہتا ہے۔

مہابھارت کی جنگ سے جس قدر خطرناک خوں ریزی واقع ہوئی اور اپنے بیگانے کٹ کر ڈھیر ہو گئے اُس نے یدھشٹر جیسے نرم دل کا دل بھی اُلٹ دیا۔ دنیا اُس کی نظروں میں سیاہ

اور اندھیری ہوگئی۔ وہ دُنیا اور کار دُنیا سے دل برداشتہ اور سخت بیزار ہو کر اُس کو لات مارنے اور جنگل میں منگل منانے پر تیار ہو گیا لیکن پیارے کرشن ہاں دل و جان سے زیادہ عزیز مقدس کرشن نے جہاں اس کو اس کا حق دلانے کے لئے سعی بلیغ کی تھی وہاں اُس کو اُس کے اصلی غرض سے بھی اس آڑے وقت میں آگاہی بخشی اور سمجھایا کہ دراصل آپ کا وجود اس دنیا میں محض جنگل میں منگل منانے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ آپ اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ ہر ایک کے حقوق کی نگہداشت کریں اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے تن من دھن سے جان توڑ کوشش کریں۔ چنانچہ آپ کی نصیحتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراج یدھشٹر کے دل میں سنسار کے جیو کی سچی خیر خواہی اور حقیقی فلاح کی روح داخل ہوگئی۔ اُنھوں نے راج پاٹ سنبھالا اور خلقِ خدا کے لئے جو کچھ عادل اور نیک نہاد بادشاہوں سے ممکن ہوتا ہے سب کچھ کیا اور کرتے رہے اور مہاراج کرشن ان کو نیک ہدایات کرتے رہے۔

لیکن مہاراج کرشن کی بے وقت وفات نے پھر رنگ بدل دیا۔ دلوں میں جو شانتی کی روح پھونکی گئی تھی۔ دفعتاً پرواز کر گئی۔ پانڈوں کے لئے نئی مصیبت اور نیا ماتم بپا ہو گیا۔ دنیا کی عیش و عشرت ایک حقیقی خیر خواہ کے بغیر سخت تر مصیبت کا سامان معلوم ہونے لگی۔

آپ کی ناگوار جدائی نے اس قدر بھی تاب و طاقت نہیں رکھی کہ دُنیا کی دلفریبیوں پر موہت (فریفتہ) رہیں۔ اس لئے دل میں یہ جوش اُٹھا کہ دنیا اور عیش دنیا کو لات مار کر اور برف میں گل کر ایسی تلخ زندگی سے ہمیشہ کے لئے رہائی حاصل کی جائے۔ چنانچہ پانچوں بھائی معہ درو پدی کے صرف پیارے کرشن کی ناگوار جدائی سے بے قرار ہو کر رشیوں اور منیوں کی پیاری سرزمین سے روتے اور آہیں بھرتے ہوئے نکل پڑے اور برف میں گل گل کہاں سے کہاں کو پہنچے۔

آہ! دنیا کی بے ثباتی۔ آہ!! پیاروں اور حقیقی نیکوں ہاں سچے خیر خواہوں کی جدائی کا ناگوار پیالہ بڑا ہی تلخ ہوتا ہے۔

اے پیارے کرشن! اے میرے محبوب کرشن!! اے سچے ہادی اور راستباز کرشن!

اے میرے مولا کے محبوب کرشن!! اگر تم اپنے پربھو (مولا کریم) سے ملنے کے لئے جلدی نہ کرتے اور سنسار کو اپنے پوتر وجود سے خالی کرنے کا خیال آپ کے دل میں پیدا نہ ہوتا تو پانڈوں کی جان یوں مفت میں ضائع نہ ہوتی۔ تمہاری بے وقت کی جدائی نے ان کو خون کے آنسوؤں سے رُلایا اور ایسا صدمہ پہنچایا کہ اُن کو اپنی زندگی کی گھڑیاں تلخ اور تاریک اور بے لطف نظر آنے لگیں۔

مہاراج کرشن کی مبارک زندگی سے ہم کو کیا کیا سبق مل سکتے ہیں؟ غور فرمائیے۔

اوّل یہ کہ دنیا میں رہ کر انسان کا فرض ہے کہ جہاں وہ خویش و اقربا کی فلاح و بہبودی کے لئے کوشاں ہو وہاں اگر اپنے ظلم و ستم اور بے جا جبر و تشدد پر کمر باندھ لیں اور بنی نوع انسان کو آئے دن ستانے دُکھ اور ایذا دینے سے دریغ نہ کریں تو اُن کی مطلق پاسداری نہ کی جائے بلکہ علی الاعلان ان کے خلاف ہونے کا ثبوت دینا فرض ہے۔

دوئم یہ کہ بنی نوع انسان کے دُکھ اور درد کو ایسا ہی محسوس کیا جائے جس طرح اپنی جان پر سختی اور مصیبت آبنی ہے اور اُن کو دُکھ اور تکالیف سے رہائی دینے کے جائز وسائل سے کام لینا اپنے فرائض میں سے سمجھنا دراصل انسانیت کا راز سمجھنا ہے۔

سوم یہ کہ اپنے نفس اور ہوا و ہوس کے بالکل ادھین (تابعدار) نہ ہو اور نہ اپنے نفس سرکش کی اس قدر رسی دراز کی جائے کہ وہ جائز اور ناجائز راہوں کی طرف چلا کر خسران مبین کا وارث بنائے۔ پھر دشمنوں کی ایذا رسانیوں پر جہاں ایک حد تک صبر کرنا ضروری ہے وہاں اس کو شوخ اور حد سے زیادہ بے باک ہونے کا موقع بھی نہ دینا فرائض میں سے ہے۔ وجہ یہ کہ اس کو نظر انداز کرنے سے خودداری کے قابل قدر اصول سے محرومی گلے کا ہار بن جاتی ہے۔

چہارم یہ کہ ہر ایک امر میں سختی سے پہلے نرمی کا پہلو اختیار کرنا فرض انسانی ہے اگر نرمی اور نصیحت سے کام نکل آئے تو سختی کرنا لاحاصل ہے۔ پھر انسان کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ جہاں وہ ہر ایک کام کے لئے خدا داد طاقتوں سے کام لے کر کوشش کرے وہاں

ہر ایک کام کے مآل کو سوچ کر کام کرے اور ایسے طریقے پر کہ جس سے اصل مقصد ہاتھ سے فوت نہ ہو۔ چنانچہ کرشن جی کا ارشاد پاک ہے کہ "انسان کا فرض ہے کہ جہاں ہر ایک کام کے لئے اپنی طاقت اور قوت بھر کوشش کرے وہاں اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ کیول ایک پربھو کے ادھین اور ایشور پر آئین ہو کر کام کرے"۔

غرض کہ یہ وہ چار سبق ہیں جو ہم کرشن جی کی زریں لائف پر غور کرنے سے اخذ کر سکتے ہیں گو یہ سچ ہے کہ آپ کی مبارک زندگی سے بہت سے قابل قدر نمونے اخذ کئے جا سکتے ہیں جن سے کسی نہ کسی رنگ میں بنی نوع انسان کو فوائد پہنچ سکتے ہیں لیکن اس صورت میں مضمون کا بڑھ جانا ممکن ہے اس لئے سردست اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

سری رام چندر جی

از مولوی محمد حسین صاحب

ہندوستان جنت نشان کی خوبیوں میں سری رام چندر جی مہاراج کا وجود مبارک بھی اس قابل گزر چکا ہے جن کے عملی ایثار کا مختصر سا ذکر ہمارے نوجوان ہندی بھائیوں کے لئے مفید اور نفع رساں ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ذیل میں کچھ عرض کر کے ہندی بھائیوں کو اُس پر توجہ کرنے کے لئے تحریک کی جائے۔

گو یہ سچ ہے کہ جن لوگوں کی زندگی اُن کے عملی نمونوں کے باعث قابل قدر ہوتی ہے اس پر مفصل اور شرح وبسط سے لکھنے ہی میں مزا آتا ہے کیونکہ ان کی زندگی کے مختلف واقعات بجائے خود نتیجہ خیز ہوتے ہیں لیکن اس صورت میں چند صفحوں پر مضمون کا سمانا امر محال ہے اور ضرورت اس کی ہے کہ صرف ان امور کا ایک گلدستہ بنا کر پیش کیا جائے جس سے جہاں ہر قوم و مذہب کے اصحاب کے دماغ معطر ہو سکیں وہاں

ہندوستان کی خوبی کا حال بھی اظہر من الشمس ہو سکے۔

آج رام چندر جی کو گزرے ایک مدتِ مدید اور عرصہ بعید ہو چکا ہے لیکن جس علمی نمونے نے ان کا نام اس وقت تک زندوں کی فہرست میں جلی حروف میں دکھلایا ہے وہ ان کی سچی وفاداری، حقیقی فرماں برداری۔ ایثار اور خودداری کے جوہر ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ واقعی انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد اور غرض سمجھنے میں نہایت ہوشیاری۔ دلیری اور مستعدی سے کام لیا تھا اور یوں اپنے آپ کو ممتاز انسانوں کے زمرہ میں شامل کرنے کے لئے بدرجہ اولی کوشش کر کے کامیابی اور بامرادی کا سارٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا۔

اگر ہم کو ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنے کی خواہش ہے اگر ہم میں سے بہت سے دُنیا میں ممتاز انسان بننے کے خواہشمند ہیں اور یقیناً ہیں تو مثل رام چندر جی کے علم کو روشن دماغی کا ذریعہ عملی طور پر یقین کر کے فرمانبرداری۔ ایثار۔ خودداری۔ اور استقلال کا مجسّم نمونہ بننا چاہیئے۔

سری رام چندر جی کو جب بن باس کا حکم ہوا تھا حقیقتاً وہ اس قدر سخت تھا جس کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جانا نہایت مشکل تھا کیونکہ شادی خانہ آبادی کے بعد اس مصیبت کا آنا اور خصوصاً راج تلک کے موقعہ پر قدرتاً البیلا تھا جس سے مستقل مزاج اور کڑے دل والے کا گھبرا جانا بھی ممکن تھا۔ خوشی کے وقت اگر رنج وغم کی سیاہ اور گھنگور گھٹائیں یک لخت آجائیں تو انسان یقیناً حواس باختہ ہو سکتا ہے۔ مگر رام چندر جی نے خوشی کے وقت میں غم اور غم کی کالی گھٹاؤں سے ذرا بھی لغزش نہیں کھائی بلکہ اس مصیبت کے پہاڑ کو نہایت استقلال اور خوشی سے اپنے کندھوں پر اُٹھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جس سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ دراصل رام چندر جی بڑے صاحب حوصلہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ایک فقیر اور سادھو کے نزدیک جنگل میں منگل منانا آسان اور سہل ہے مگر ایک ناز و نعم میں پرورش پانے والے کے لئے اور وہ بھی نہ ایک نہ دو بلکہ

کال چودہ برس کے لیے بہت ہی دشوار اور مشکل ہے لیکن مہاراج رام چندر کی زرّیں لائف ہم سمجھاتی ہے کہ وہ اس قسم کے بلند ہمت تھے کہ اُن کے نزدیک چودہ سال کی مدت بالکل معمولی مدت تھی۔

اگر رام چندر کی لائف کو دنیوی وجاہت کے لحاظ سے دوسرے شہزادوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں تو صرف رام چندر جی کا وجود ان سب میں ممتاز ثابت ہوتا ہے کیونکہ اول الذکر میں سوائے اپنے نفسانی اغراض اور اپنی بھلائی کے وسائل زیر نظر رکھنے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر برخلاف اس کے موخر الذکر نے انسانیت کا راز یہ سمجھا تھا کہ دوسرے کی بھلائی کی خاطر اپنی جان پر مصیبت آجائے ہاں عیش و عشرت پر لات مارنی پڑے تو کچھ فکر کی بات نہیں۔

کہنے کو تو رانی کیکئی سری رام چندر جی کی سوتیلی والدہ تھیں اس لئے یہ ممکن تھا کہ رام چندر جی کے دل میں ان کے ارشاد کی وقعت نہ ہوتی یا وہ ان کے ارشاد کی تعمیل میں عیش و عشرت پر لات مارنے پر تیار نہ ہوتے خصوصاً اس حالت میں جب کہ تمام رعیت آپ کی طرفدار تھی مگر سری رام چندر جی کے عملی ایثار نے ثابت کر دیا کہ کیکئی کی عزت اور عظمت ان کے دل میں مہارانی کوشلیا سے کم نہ تھی اور وہ اپنے سوتیلے بھائی بھرت کو بھی اسی طرح ہی دل سے عزیز رکھتے تھے جیسے اپنی جان شیریں کو چنانچہ جب ماتا کیکئی کا یہ ارشاد سُنا کہ وہ چودہ برس بنوں میں رہیں اور میرا لڑکا بھرت راج پاٹ سنبھالے تو آپ نے نہایت خوشی سے اس ارشاد کو منظور کر کے اجودھیا نواسیوں کو آگاہی دیتے ہوئے صاف الفاظ میں اپنے دلی خیالات یا یقین کا یوں اعلان کر دیا کہ دریں اور بھرت دو نہیں۔ میں اپنی سعادت مندی اس امر میں یقین کرتا ہوں کہ ماتا کا حکم بجا لاؤں اور بھرت راج کریں اے لوگو! خوش ہو کہ تم کو ایک نیک، عادل، رعایا نواز اور روشن خیال راجہ ملتا ہے"۔

اجودھیا نواسیوں کے دلوں میں چونکہ آپ کی محبت نے گھر کیا تھا اس لئے اُن کو آپ کی جدائی شاق گزری اور انہوں نے ہر ایک طرح سے آپ کو سمجھانا اور روکنا چاہا لیکن آپ نے والدین کے ارشاد کی تعمیل کو اس قدر ضروری یقین کیا ہوا تھا کہ صاف الفاظ

میں ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یوں سمجھایا کہ " والدین کے قدموں میں جنت ہے وہ فرزند کیسا خوش نصیب ہے جس کو والدین کی فرماں برداری اور اطاعت کا موقعہ نصیب ہو اور وہ اس میں کامیاب ہو۔ وہ پسر نہایت ہی بدنصیب ہے جو اس نعمت سے محروم رہے۔ چودہ برس کا زمانہ کٹ جانا مشکل نہیں۔ خواب کی طرح سے گزر جائے گا مگر عدول حکمی کا داغ ایسا خطرناک ہے جس کا دھلنا امر محال ہے۔"

آخر رام چندر نے بڑی بہادری اور دلیری سے عیش و عشرت سے مفارقت کے پیالہ کو پیا اور جنگل کی راہ لی۔ پھر وہاں سے چودہ برس کامل نہ صرف اجودھیا میں بلکہ کسی دوسری بستی میں بھی داخل ہونے سے احتراز کرکے استقلال اور اعلیٰ درجہ کی فرمانبرداری کا وہ قابل قدر نمونہ دکھایا کہ آج دنیا میں ہر طرف سے "سری رام چندر جی کی جے" کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ فرماں برداری اور اطاعت کا جو اگر دن پر رکھنے سے انسان کو ایک طاقت اور قوت عطا ہوتی ہے جس سے بڑھ کر اس کا کوئی یار و غم گسار نہیں ہوتا۔

کہنے کو تو رام چندر جی کی مفارقت میں آپ کی رعایا میں کوئی فرد و بشر نہ تھا جو آٹھ آٹھ آنسو نہ رویا ہو لیکن کیا سوائے لچھمن جی اور مہارانی ستیا کے حقیقی طور پر کسی نے آپ کا ساتھ دیا؟ ہرگز نہیں اور کیونکر کوئی ساتھ دیتا جبکہ سری لچھمن اور جنابہ سیتا جیسے دل و گردے والے مفقود تھے۔

پیارے ناظرین! ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اس سے ہماری یہ غرض نہیں کہ آپ کے آگے ایک پرانا قصہ پیش کرکے آپ کے عزیز اور قیمتی وقت کا خون کریں بلکہ محض اس لئے کہ آپ کو اور خود ہم کو ذیل کے نتائج اخذ کرکے خاص سبق حاصل کرنے کا موقعہ نصیب ہو۔

(۱) ہماری زندگی کا مقصد اعلیٰ جہاں یہ ہے کہ ہم اپنے دل و دماغ کو علم کی روشنی سے منور کریں وہاں یہ بھی ہمارے فرائض میں سے ہے کہ علم کو خاص کام لینے کا ذریعہ بنا دیں۔

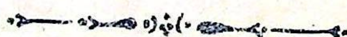
(۲) جس طرح ہمارے دل میں اپنی بھلائی اور بہبودی کے لئے ان تھک کوشش کرنے کا

جوش ہو اسی طرح دوسرے کی فلاح کے لئے بھی تن۔ من۔ دھن سے کوشش کرنا اپنے فرائض میں سے یقین کیا جائے۔

(۳) دوسرے کی فلاح وبہبودی کے لئے اگر اپنی عیش وعشرت کی سیجوں سے جدا ہونا پڑے تو ہم وحزن سینہ کاوی کا ذریعہ نہ بن سکیں بلکہ دوسرے کی بھلائی کے لئے ہر ایک قسم کی مصیبت کو عین راحت سرور اور سچا ذوق یقین کیا جائے۔

(۴) سوتیلے بھائی بہن ایسے ہی عزیز یقین کئے جائیں جیسے اپنے حقیقی یقین کئے جاتے ہیں اور سوتیلی والدہ کی عزت بعظمت اور وقر کا سکہ ایسا ہی دل میں بٹھانا ضروری ہے جس طرح اپنی حقیقی والدہ کا۔ کیونکہ والد سے تعلق کی وجہ سے بھی دراصل اس لائق ہے کہ اس کی اطاعت اور فرماں برداری سے انکار نہ کیا جائے۔ فرماں برداری واطاعت کا تلک نافرمانی کے زریں تاج سے بدرجہا بہتر ہے۔

یہ وہ چار سبق ہیں جو سری رام چندرجی کی زریں لائف سے ملتے ہیں۔ مبارک ہے وہ جوان سے فوائد اخذ کرنے کے لئے تیار رہو۔



مہاراج یدھشٹر

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کو کہ یہ
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

مہاراجہ بھرت کی نسل میں سے راجہ بچتربیرج ہستنا پور میں راج کرتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ دھرتراشٹ اور پنڈو۔ دھرتراشٹ اندھا تھا۔ اس لئے بچترببرج کے بعد اس کا چھوٹا لڑکا پنڈو تخت نشین ہوا۔ تھوڑی مدت راج کرنے کے بعد پنڈو اپنی دونوں رانیوں سمیت جنگل کو چلا گیا اور دھرتراشٹ راج کرنے لگا۔ جنگل میں پنڈو کے پانچ راجکمار پیدا ہوئے۔ مادری سے نکل۔ سہدیو اور کنتی سے یدھشٹر۔ بھیم اور

ارجن۔ پنڈو جنگل میں مر گیا۔ مادری اس کے ساتھ ستی ہو گئی۔ کنتی پانچوں بچوں کو ساتھ لے کر ہستناپور میں واپس آگئی۔

دھرتراشٹ بڑا تھا اور اب راج کرتا تھا اس لیے اس کے لڑکے اپنے آپ کو راج کا وارث خیال کرتے تھے۔ پنڈو راج کر چکا تھا اور جب اُسے راج ملا تھا اس وقت دھرتراشٹ حکومت کرنے کے ناقابل سمجھا گیا تھا۔ اس لیے پنڈو کے لڑکے بھی راج کے وارث تصور کیے جا سکتے تھے۔ دھرتراشٹ کے لڑکوں (کوروں) نے جن میں سے دریودھن بڑا تھا پانڈوں کے آنے کو ایک بلائے ناگہانی سمجھا اور اس ڈر سے کہ مبادا ان کے سبب سے وہ راج سے محروم کیے جائیں پانڈو ہر فن میں چچا زاد بھائیوں سے سبقت لے گئے۔ اس سے ان کی حسد کی آگ اور بھی تیز ہو گئی۔ کچھ عرصہ گزرا اور اندھے راجہ نے یدھشٹر کو یوراجہ (چھوٹا راجہ) مقرر کیا تاکہ راج کے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ دریودھن اور اس کے بھائیوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دریودھن نے راجہ سے کہا "تخت کے وارث ہم ہیں۔ آپ ہمیں بے دخل کرتے ہیں۔ میں ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ خیریت اور امن اسی میں ہے کہ ہم اور پانڈو الگ الگ رہیں"۔ راجہ نے اُسے بہترا سمجھایا لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ آخر مجبور ہو کر راجہ نے پانڈو سے کہا "میرے عزیزو دریودھن کی عقل میں کچھ فتور آگیا ہے اس لیے وہ بضد ہے کہ تم علیحدہ رہو۔ کچھ دیر کے لیے تم وارناوٹ چلے جاؤ۔ میں اُسے سمجھا بجھا کر جلدی تمہیں واپس بلا لوں گا۔ پانڈوں نے چچا کا حکم سر آنکھوں پر قبول کیا اور وارناوٹ جانے کو راضی ہو گئے۔

وہاں جو مکان ان کی رہائش کے لیے تعمیر ہوا اس میں رال وغیرہ مصالحے ڈالے گئے۔ اس سے غرض یہ تھی کہ جب پانڈو وہاں جا رہیں تو مکان کو آگ لگا کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مکان کو آگ لگتے ہی پانڈو تو ایک پوشیدہ سرنگ کے رستے باہر نکل گئے۔ ایک عورت اور کچھ آدمی جل گئے۔ دریودھن اور دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ پانڈو جل گئے۔ دریودھن کے دوستوں نے اُسے مبارکبادیں دیں۔ پانڈوں کے دوستوں نے دانتوں میں انگلیاں دبالیں اور پاپی دریودھن پر ہزار بار نفرین کی۔

پانڈو بھیس بدل کر پھرتے رہے۔ اتنے میں انہوں نے سُنا کہ راجہ دروپد کی لڑکی دروپدی کا سوئمبر ہونے والا ہے۔ سوئمبر کے مقام پر جہاں سارے راجہ اور تماشائی جمع تھے۔ یہ بھی برہمنوں کے بھیس میں جا پہنچے۔ کمان درمیان میں پڑی تھی۔ دروپد کے لڑکے نے بڑھ کر با آواز بلند کہا" دوستو! یہ کڑی کمان پڑی ہے۔ سامنے لکڑی پر مچھلی لگی ہے جو شخص اس کمان سے ایسا تیر چلائے کہ اس چکر سے گزر کر مچھلی کی آنکھ میں لگے۔ وہ دروپدی کا شوہر ہوگا" یہ سُن کر یکے بعد دیگرے راجاؤں نے کمان سے تیر مارنے کی کوشش کی مگر وہ کمان کو اُٹھا تک نہ سکے۔ یہ دیکھ کر ایک فقیر برہمنوں کی صف میں سے آگے بڑھا۔ لوگوں نے حیرت اور غصہ کی وجہ سے شور مچا دیا۔ اس نے کچھ پرواہ نہیں کی۔ کمان اُٹھا کر ایک تیر پھینکا۔ وہ چکر سے گزر کر مچھلی کی آنکھ میں جا لگا۔ تماشائیوں نے خوشی کے نعرے بلند کئے۔ راجہ جو اکٹھے ہوئے تھے غصہ سے لال ہو گئے۔ دروپد خود پشیمان ہوا کہ راج کماری ایک فقیر کی بیاہتا بنے گی۔ دروپدی کو یہ برہمن اپنے ڈیرے پر لے گئے۔ راجہ کی طرف سے ایک آدمی ان کا حسب و نسب دریافت کرنے پہنچا۔ یدھشٹر نے کہا" سوئمبر کی شرط پوری ہو گئی۔ اب حسب و نسب پوچھنے کے کیا معنی ہیں؟" تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے ظاہر کر دیا کہ وہ پانڈو ہیں اور دریودھن کی عداوت کی وجہ سے بھیس بدلے ہوئے بھٹکتے پھرتے ہیں۔ دروپد بہت خوش ہوا۔ ارجن سے بہتر داماد اُسے کہاں سے مل سکتا تھا؟ شادی دھوم دھام سے ہوئی۔

پانڈو دھرتراشٹ کی درخواست پر ہستناپور گئے۔ راجہ نے آدھا راج انہیں دے دیا اور انہوں نے اندرپرست کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ وہاں بہت اچھے اچھے مکان تعمیر کرائے۔ ایک محل کی تعمیر میں تو انجینیئر نے کمال لیاقت کا اظہار کیا۔ یدھشٹر نے یگیہ کیا اور گرد و نواح کے راجوں کو یگیہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ بہت سے لوگ شامل ہوئے۔ دریودھن بھی آیا۔ ایک جگہ اُسے تالاب دکھائی دیا۔ نہانے کے خیال سے اس نے کپڑے اتارے۔ جب اس میں کودا تو فرش سے ہاتھ پاؤں جا لگے۔ کچھ چوٹ آئی اور شرمندہ ہو کر کپڑے پہن لئے۔ آگے جا رہا تھا۔ ایک جگہ صاف فرش نظر آیا۔ آگے

بڑھا تو پانی میں گر پڑا۔ شرمندہ ہوا اور نکل کر چاہا کہ پاس کے ایک دروازہ سے گزر جائے۔ کنڈی کھولنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ دیوار کو جا لگا۔ دیکھا تو دروازہ فقط دکھائی دیتا تھا۔ اصل میں موجود نہ تھا۔ اوپر دریچے میں درو پدی بیٹھی تھی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور کہا "اندھے کے اندھے[۱] دیکھو تو پیچھے ارجن اور بھیم آرہے تھے انہوں نے قہقہہ لگایا اور آواز دی "بھائی ٹھہر جاؤ۔ ہم آتے ہیں"۔ دریودھن دل میں بہت جلا اور خیال کیا کہ ارجن اور بھیم محض مذاق کی غرض سے پیچھے رہ گئے تھے۔ حسد اور کینہ کی آگ اس کے سینہ میں ایسی بھڑک اٹھی کہ زندگی بھر نہ بجھی۔

وہاں سے واپس جا کر اس نے بہت پیچ وتاب کھائے اور چاہا کہ پانڈوں سے بدلہ لے۔ انسان صورت اور شیطان سیرت۔ ماموں (شکنی) کی صلاح سے یدھشٹر کے ساتھ جوا کھیلنے کی ٹھہرائی۔ بدقسمتی سے یدھشٹر کے کیرکٹر میں ایک بڑی کمزوری تھی۔ وہ جوا کھیلتا تھا اور خاصکر جب کوئی اسے جوا کھیلنے کی دعوت دیتا تو اسے قبول نہ کرنا۔ وہ عالی حوصلگی سے بعید خیال کرتا تھا۔ دریودھن نے ہستنا پور سے اسے جوا کھیلنے کی دعوت دی۔ یدھشٹر وہاں پہنچا اور جوا کھیلتے کھیلتے سارا مال واسباب ہار دیا۔ پھر چاروں بھائیوں کو۔ اپنے آپ کو۔ یہاں تک کہ درو پدی کو بھی ہار دیا۔

دریودھن نے دوشاسن کو بھیجا کہ درو پدی کو بے حرمتی سے پکڑ لائے۔ درو پدی وہاں سے لائی گئی۔ دریودھن نے اسے بھری محفل میں بے عزت کرنا چاہا لیکن لوگوں کے ڈانٹنے پر باز آگیا۔ دھرتراشٹ نے پانڈوں کو آزاد کر دیا اور وہاں سے چل دیئے۔ اس سے دریودھن کی تسلی نہ ہوئی۔ یدھشٹر کو واپس بلایا اور پھر دونوں جوا کھیلے۔ اب کے شرط یہ تھی کہ جو ہارے وہ جنگلوں میں بارہ برس تک فقیرانہ زندگی بسر کرے اور تیرھویں سال ایسی حالت میں رہے کہ مخالف فریق کا کوئی آدمی اسے پہچان نہ سکے اگر کوئی شخص پہچان لے تو ۱۲ سال کی جلاوطنی پھر شروع ہو جائے۔ پھر

[۱] دریودھن کے باپ دھرتراشٹ کے اندھا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

یدھشٹر ہارا اور پانڈوں نے جنگلوں میں جانے کی تیاری کی۔ اس رقت انگیز نظارہ کو دیکھ کر ہزاروں آدمی چلائے لیکن سنگدل کوروں کا دل بالکل نہ پسیجا اور وہ جو سامان برسوں سے اپنے چچازاد بھائیوں کی تباہی کے لئے کر رہے تھے آخر اس میں کامیاب ہوئے۔

پانڈو بن میں جانے لگے تو بہت سے برہمن ان کے ساتھ ہوئے۔ یدھشٹر نے ان سے کہا "مہاراج جنگلوں میں کئی قسم کے دکھ ہوں گے۔ پھل پھول کبھی میسر ہوں گے۔ کبھی یوں ہی دن کاٹنے پڑیں گے۔ ہم تو سر آئی سہتے ہیں۔ تم کیوں ہمارے ساتھ دکھ اٹھاتے ہو"۔ برہمنوں نے کہا "جب آپ جنگل میں گزارہ کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے کیا مشکل ہے؟ آپ راجہ ہیں۔ محلوں میں رہتے رہے ہیں۔ تکلیف تو آپ کو ہوگی۔ ہمیں کیا تکلیف ہے؟ ہم ضرور آپ کے ساتھ چلیں گے اور تپ کریں گے"۔ جنگل میں جو سادھو انہیں دیکھتے ان کی حالت پر افسوس کرتے۔ ایک دن مارکنڈی آئے اور بھیم یدھشٹر اور دروپدی کو اس حال میں دیکھ کر مسکرانے لگے۔ یدھشٹر نے کہا "آج تک جتنے لوگوں نے ہمیں یہاں دیکھا ہے ہمارے حال پر افسوس کرتے ہیں۔ آپ کے مسکرانے کا کیا محل ہے؟ ہم مصیبت زدوں کی مصیبت دیکھ کر آپ خوش ہوتے ہیں۔ اچھا شکر پرماتما کا"! مارکنڈے پھر مسکرائے اور کہا "تم پر مصیبت ضرور ہے لیکن اوروں پر بھی مصیبتیں آتی ہیں تمہیں دیکھ کر مجھے رام چندرجی کا دھیان آتا ہے جنہیں تخت ملتے ملتے بن باس مل گیا۔ چودہ برس تک انہوں نے جنگلوں کی خاک چھانی لیکن اس عرصہ کے بعد پھر وہ جا کر اسی تخت پر جلوہ آرا ہوئے۔ تم بھی یقین جانو۔ یہ مصیبت تمہارا یہیں خاتمہ نہیں کر دے گی۔ یہ دن جوں توں کر کے کٹ جائیں گے۔ پاپ کا زور ٹوٹے گا اور پھر تم راج کرو گے"!

دروپدی نے کئی بار یدھشٹر سے کہا "ہماری مصیبت دیکھ کر تمہیں ترس نہیں آتا۔ اپنی حالت دیکھ کر تم کو تکلیف نہیں ہوتی؟ تمہیں کس بات کی ہے؟ ایسے شہ زور تمہارے بھائی ہیں۔ رعایا تم پر دل و جان سے نثار ہے۔ چلو واپس چلو۔ جو راج ادھرم سے چھینا گیا ہے اس پر قبضہ کرو اور مزے سے زندگی کے دن کاٹو"۔ دوسرے بھائیوں نے

کئی بار اپنی طاقت کا ذکر کیا اور دیگر مددگار راجوں کی مدد کا یقین دلایا مگر یدھشٹر نے ہمیشہ انہیں یہی جواب دیا "جواں مرد اپنے قول کا پاس کرتے ہیں۔ جب ہم نے ایک دفعہ ۱۳ سال کس مپرسی اور گم نامی کی حالت میں گزارنے کا اقرار کر لیا ہے تو راج پاٹ یا دیگر آراموں کی خاطر واپس لوٹنا نامردی ہے۔ غصہ انسان کی طاقت کا نشان نہیں بلکہ کمزوری کا نشان ہے۔ انتظار کرو۔ وقت آئے گا جب ہم واپس چلیں گے اور پھر عیش و آرام سے گزرے گی۔"

نہوشہ سے بات چیت

ایک دن بھیم معمولی وقت پر گھر واپس نہ آیا۔ یدھشٹر اس کی تلاش میں گیا۔ دیکھا تو نہوشہ نے اُسے پکڑ رکھا ہے۔ یدھشٹر نے نہوشہ سے کہا "میرے بھائی کو آزاد کر دو۔" اس نے جواب دیا "میرا ارادہ اسے آزاد کرنے کا نہیں لیکن اگر تم میرے دو سوالوں کا جواب دو تو میں اسے چھوڑ دوں گا۔" یدھشٹر نے سوال پوچھے۔ نہوشہ نے کہا "پہلا سوال یہ ہے کہ برہمن کون ہے؟ دوسرا سوال یہ بتاؤ کہ کون سی چیز جاننے کے قابل ہے۔"

یدھشٹر نے کہا "جاننے کے قابل پرماتما ہے جو دکھوں اور سکھوں سے برتر ہے۔ برہمن وہ ہے جس میں سچائی۔ دان۔ عفو۔ مہربانی اور دیگر ایسی صفات موجود ہوں جو اپنے درن کے فرائض ادا کرتا ہے اور دیگر درنوں کی بہتری کے لئے کوشش کرتا ہے جو وید شاستر کو پڑھتا ہے اور ان کی ہدایتوں پر عمل کرتا ہے۔"

نہوشہ۔ جو صفات اور اعمال تم نے بیان کئے ہیں وہ شودر میں بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر برہمن کو کیونکر تمیز کر سکتے ہیں؟

یدھشٹر۔ شودر کے گن برہمن میں نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی برہمن کے گن شودر میں ہو سکتے ہیں۔ شودر پیدائش سے ہی شودر نہیں بن جاتا۔ نہ برہمن پیدائش سے برہمن بنتا ہے جس شخص میں یہ صفات اور اعمال ہیں وہ برہمن کی اولاد نہ ہونے پر بھی برہمن ہی ہے۔

نہوشہ نے پرماتما کے متعلق بھی سوال کئے۔ جن کا جواب ملنے پر بھیم رہا کیا گیا۔

علو ہمتی کی نادر مثال

جنگل میں رہتے کئی سال گزر گئے۔ کرن اور شکنی نے دریودھن سے کہا ”ممکن ہے یدھشٹر وغیرہ جنگل میں آرام سے دن کاٹ رہے ہوں۔ چلو انہیں مل کر دق کریں۔ ہم کروفر سے سپاہیوں کی ایک جمعیت ساتھ لے کر چلتے ہیں پانڈوں کو چٹکیں لگے یہاں سے رانی زیور سنگار سے آراستہ ہو کر جائے گی۔ اسے دیکھ کر دروپدی کا دل جلے گا۔ پانڈوں کڑھیں گے لیکن یدھشٹر کو بات کا پاس ہے۔ اس سلوک سے دق ہو کر بھی وہ تیرہ برس سے پہلے بن سے واپس نہیں آئیں گے“ بڑی مشکل سے دہر تراشٹ سے اجازت حاصل کی اور بن کی طرف چلے۔ راستہ میں ایک جگہ ڈیرے ڈال دیئے۔ دریودھن کے آدمی باہر گئے۔ ایک احاطہ میں داخل ہونے لگے تو دربان نے روک دیا۔ دریودھن کو معلوم ہوا بہت جھنجھلایا اور حکم دیا ”ابھی ان کی سرکوبی کی جائے“ مقابلہ میں دریودھن مخالفوں (گندھروں) کے ہاتھ آ گیا۔ دریودھن کے ساتھی یدھشٹر کے پاس پہنچے اور اس کو یہ ماجرا کہہ سنایا۔ بھیم نے سُن کر کہا ”تم ہمیں ستانے آئے تھے۔ چاہ کن را چاہ درپیش۔ اپنی کردنی اپنے ہی پیش آ گئی۔ اچھا ہوا گندھروں نے پاپی دریودھن کو پکڑ لیا۔ کم بخت دریودھن کا خاتمہ ہو جائے تو بہت سا دکھ دور ہو جائے“۔ یدھشٹر نے یہ الفاظ سُن کر اسے ڈانٹا اور کہا ”عزیز کورو! اس وقت تکلیف میں ہیں اور ہمارے پاس مدد کی درخواست لے کر آئے ہیں۔ یہ وقت نہیں کہ تم طعن و تشنیع کرو۔ رشتہ داروں میں تنازعے ہوا ہی کرتے ہیں۔ خانگی جھگڑے تو جاری رہیں گے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دوسرے لوگ ہمارے خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈال لیں۔ آخر ہم بھائی بھائی ہیں۔ جیسا ان کا خاندان ہے ویسا ہی ہمارا ہے بھیم نے کہا ”ہم تو پانچ بھائی ہیں۔ کورو ایک سو ایک ہیں۔ وہ جائیں لڑیں۔ ہمیں دخل دینے کی ضرورت نہیں“ یدھشٹر نے کہا ”بے شک ہم پانچ ہیں اور وہ ایک سو ایک لیکن یہ اس حالت میں ہی درست ہے جب ہمارا مقابلہ ایک دوسرے سے ہو۔ جب ہمارا مقابلہ غیروں سے ہے تو ہم ایک سو چھ بھائی ہیں۔ ایک سو چھ ہیں۔ کان کھول کر

سنو۔ پھر تیسری بار کہتا ہوں۔ ہم ایک سو چھ بھائی ہیں۔ گندھروں نے ہمارے بھائیوں کو قید کیا ہے اور ہمارے خاندان کی عورتوں کو پکڑ لیا ہے۔ یہ ہماری بے حرمتی ہے۔ جاؤ۔ اُن سے کہو کہ انہیں آزاد کر دیں۔ اگر کہنے سے نہ مانیں تو ہم زورِ بازو سے کام لیں گے کشتری کا دھرم ہے کہ اجنبی بھی اس سے پناہ مانگے تو پناہ دے۔ اس سے مدد کا خواستگار ہو تو مدد کرے۔ کسی ور کا حاصل کرنا۔ راج کو پالینا یا صاحب اولاد ہونا بڑی نعمتیں ہیں لیکن ان سب سے بڑی نعمت ایک دشمن کا آزاد کرانا ہے۔ جب وہ مدد کا خواستگار ہو۔ اجنبی تو اجنبی رہے اب تو بھائی مدد مانگتے ہیں۔ جاؤ۔ قیل وقال کا وقت نہیں۔" غرض یہ لوگ پہنچے اور وہاں کچھ جنگ ہوئی۔ گندھروں نے کہا "درلودھن وغیرہ ہمیں دق کرنے آئے تھے ہم نے تو تمہاری خاطر انہیں قید کیا۔ اگر مہاراج یدھشٹر سارا حال سن کر درلودھن وغیرہ کو آزاد کرنے کے لئے کہیں گے تو ہم چھوڑ دیں گے" یدھشٹر کے پاس گئے۔ انہوں نے کہا "آپ کی خیر خواہی کے لئے ہم شکر گزار ہیں لیکن ہم خانگی تنازعوں میں خاندان کی بے حرمتی نہیں چاہتے۔ آپ انہیں آزاد کر دیں" درلودھن وغیرہ شرم سے تربتر بنوں سے واپس لوٹ گئے۔

یکش کے سوال اور اُن کے جواب

ایک موقعہ پر جب پانچوں بھائی چل پھر کر تھک گئے تھے پیاس نے انہیں ستایا نکل نے ایک درخت پر چڑھ کر پاس ہی ایک جھیل دیکھی وہ پانی لینے گیا لیکن واپس نہ لوٹا۔ اسی طرح ارجن اور بھیم بھی گئے اور وہیں رہے۔ یدھشٹر وہاں گیا اور دیکھا۔ چاروں بھائی بے ہوش پڑے ہیں درخت پر سے ایک آواز آئی "یدھشٹر اگر زندگی کی پروا کرتے ہو تو ابھی پانی مت پیو۔ پہلے میرے سوالوں کا جواب دے لو"

یدھشٹر نے یکش کے سوال سنے اور اُن کے جواب دیئے۔ جن میں سے بعض نمونہ کے طور پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

س۱ برہمن کب دیوتا کہلانے کا مستحق ہے؟ اس کا خاص عمل کیا ہے؟

کس بات میں وہ دوسرے انسانوں سے ملتا ہے؟ کون سا کام برہمن کے لئے معیوب ہے؟

ج۔ ویدوں کے پڑھنے سے برہمن دیوتا کہلانے کا مستحق ہے۔ تپ اور ریاضت اس کے خاص نیک عمل ہیں۔ اسے بھی دوسرے انسانوں کی طرح مرنا ہے۔ غیبت اور نندا کرنا اس کے لئے بہت معیوب فعل ہے۔

س۔ کشتری کب دیوتا کہلانے کا مستحق ہے؟ اس کا خاص نیک عمل کیا ہے۔ کس بات میں وہ دوسرے انسانوں سے ملتا ہے؟ کون سا کام اس کے لئے بہت معیوب ہے؟

ج۔ ہتھیاروں کے مناسب استعمال سے کشتری دیوتا کہلانے کا سزاوار بنتا ہے۔ یگیوں کا کرنا کشتری کے لئے خاص نیک عمل ہے۔ اسے بھی ڈر لگ سکتا ہے۔ اس بات میں وہ دوسرے انسانوں سے ملتا ہے۔ مدد مانگنے والے کو پناہ نہ دینا اس کے لئے معیوب ہے۔

س۔ سب سے قابل تعریف چیز۔ سب سے قیمتی مال۔ سب سے بڑا نفع سب سے اعلیٰ خوشی کیا ہے؟

ج۔ سب سے قابل تعریف چیز کسی کسب میں کمال ہے۔ سب سے قیمتی مال علم ہے سب سے بڑا نفع صحت ہے۔ سب سے اعلیٰ خوشی قناعت ہے۔

س۔ استقلال کیا ہے؟ سچا اشنان کیا ہے؟

ج۔ اپنے فرائض کا ادا کیے جانا استقلال ہے۔ دل کو پاپوں سے صاف کر دینا سچا اشنان ہے۔

س۔ کون شخص دوزخ میں جانے کا سامان کر رہا ہے؟

ج (ا) وہ شخص جو ویدوں اور نیک شخصوں کے برخلاف بولتا ہے۔

(ب) وہ شخص جو بہت کچھ رکھتے ہوئے بھی نیک کاموں میں خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے۔

س۔ سب سے عجیب بات کیا ہے؟

ج۔ ہر روز ہزاروں آدمی مرتے ہیں لیکن جو زندہ ہیں وہ اپنے آپ کو ... سمجھے بیٹھے ہیں۔ اس سے زیادہ عجیب کوئی بات نہیں۔

جب یکش بہت سے سوال کر چکا تو اُس نے کہا" یدھشٹر میں تمہارے جوابوں کو سُن کر بہت خوش ہوا ہوں۔ ان چاروں میں سے ایک کو میں زندہ کر سکتا ہوں۔ کہو کسے زندہ کروں؟"

یدھشٹر نے کہا" اگر ایک ہی زندہ ہو سکتا ہے تو نکل زندہ ہو جائے۔"

یکش۔ ہیں، بھیم تم کو عزیز ہے۔ ارجن کے زور بازو پر تم سب کو ناز ہے۔ ایسے ان بھائیوں کو چھوڑ کر تم سوتیلے بھائی نکل کو زندہ کر کے کیا کرو گے؟

یدھشٹر۔ ارجن اور بھیم مجھے عزیز ہیں لیکن دھرم ان سے زیادہ عزیز ہے۔ جو شخص دھرم کو بچاتے ہیں دھرم ان کو بچاتا ہے۔ جو شخص دھرم کو ناش کرتے ہیں، دھرم ان کا ناش کرتا ہے۔ میں بھائیوں کی محبت کی وجہ سے لغزش نہیں کھا سکتا۔ میرے پتا کی دو رانیاں تھیں۔ میں دونوں کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری سوتیلی ماں بے اولاد رہ جائے اور میری ماں کے تین بیٹے ہوں۔

یکش نے کہا" تم نے دھرم کی رکھشا کی ہے تو دھرم تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ تمہارے چاروں بھائی زندہ ہوتے ہیں اور وہ چاروں ہوش میں آ گئے۔

دراٹ میں ملازمت

۱۲ برس جوں توں کر کے کٹے۔ تیرھواں برس چھپ کر گزارنا تھا۔ شرط یہ تھی کہ اگر کوئی کورو تیرھویں سال کہیں پانڈوں کو دیکھ لیں گے تو انہیں اور بارہ سال بنوں میں رہنا ہوگا اس لئے صلاح یہ ٹھہری کہ بھیس بدل کر راجہ دراٹ کے محلوں میں جا کر ملازم ہو جائیں یدھشٹر نے کہا" میں راجہ کو پانسہ وغیرہ کھلانے پر مقرر ہو سکتا ہوں" بھیم نے کہا کہ میں باورچی کا کام جانتا ہوں۔ ارجن نے کہا" میں ہیجڑا بن کر محل سرائے میں لڑکیوں کو رقص و سرود سکھانے کے لئے داخل ہو سکتا ہوں" نکل اور سہدیو نے کہا" ہم گھوڑوں اور گایوں

کی حفاظت کا کام کریں گے۔" دروپدی نے کہا "میں رانی کی کنیز بن جاؤں گی" آخر یہ سب راجہ دراٹ کے محل میں مختلف وقتوں پر جا کر نوکر ہو گئے۔ اس سال کے لئے انہوں نے اپنے نام بدل لئے۔ نکل اگر یانگ بن گیا۔ سہدیو نے آستم اور بھیم نے بلوا اپنا نام رکھ لیا۔ یدھشٹر کنک اور ارجن درہنال کہلانے لگے۔ دروپدی نے سرندھری نام اختیار کیا۔ یہاں آ کر ان کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا کیچک راجہ کا ایک معتمد تھا جو اپنے آپ کو رانی کا بھائی کہتا تھا۔ ایک دن کیچک کی نظر سرندھری پر پڑی۔ دیکھتے ہی اس پر شیدا ہو گیا اور رانی سے کہا "بہن میری زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے تمہاری کنیز کو میں چاہتا ہوں" رانی نے کہا "گراوٹ کی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ تم اپنی حیثیت دیکھو۔ شرم و حیا کو تم نے بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ لوگ بہنوں سے ایسے کام لیتے ہیں؟" کیچک نے اصرار کیا۔ رانی نے سرندھری کو بلایا اور اُسے بہانے سے کیچک کے کمرہ میں بھیجا۔ سرندھری پر کیچک نے ہاتھ ڈالا۔ اس نے اُسے جھٹکا دے کر ہٹا دیا اور روتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کیچک پیچھے پیچھے آ گیا اور بجائے اس کے کہ شرمندہ ہوتا سرندھری کے دو چار لاتیں لگائیں اور اُس کے بال نوچے۔ سرندھری نے علیحدہ بھیم سے اپنا رونا رویا۔ اُس نے کہا کہ تم کیچک سے کہو کہ فلاں کمرے میں رات کے بارہ بجے آ جائے میں وہاں اس کا کام تمام کر دوں گا۔ چنانچہ رات کو کیچک کا کام تمام کیا گیا۔ صبح محل میں کہرام مچ گیا۔ کیچک کے دوستوں نے سمجھا کہ سرندھری کیچک کی موت کا سبب ہوئی ہے۔ سرندھری کو بھی پکڑ کر لے گئے اور چتا پر اسے لٹا دیا۔ آگ لگنے کو تھی کہ بھیم آ پہنچا اور سخت جدوجہد سے اُس نے سرندھری کو بچا لیا۔

کیچک کی موت کی خبر فوراً پھیل گئی۔ دراٹ کے دشمنوں نے سمجھا کہ اب راجہ کی طاقت گھٹ گئی ہے موقعہ ہے کہ اسے دق کریں۔ دریودھن کے آدمیوں نے ایک طرف سے آ کر علاقہ میں دست اندازی شروع کر دی۔ دراٹ نے مقابلہ کرنا چاہا۔ اُس کے ساتھ منجملہ اور آدمیوں کے پانڈو بھی تھے۔ دراٹ پکڑا گیا اور ان کی ہمت سے

آزاد ہوا اس لئے وہ ان کا ممنون ہو گیا۔ دوسری طرف سے بھی کوروں نے علاقہ پر حملہ کر دیا۔ راجہ کے بیٹے اتر کو اطلاع ہوئی اس نے رتھ تیار کرایا اور درہنال (ارجن) کی تعریف سُن کر اسے رتھ بان مقرر کیا جب کوروں کی فوج سامنے آئی تو اتر کے اوسان خطا ہو گئے۔ رتھ سے اُتر کر وہ بھاگنے لگا۔ درہنال نے اُسے پکڑ کر رتھ پر بٹھا لیا اور کہا خبردار۔ یہاں سے مت ہلو۔ رتھ کو لے کر وہ شامی درخت کی طرف گئے جہاں ارجن ہتھیار رکھ آیا تھا۔ وہاں سے ہتھیار لئے ارجن نے اپنے آپ کو ظاہر کیا اور کہا "تم میرے رتھ بان بنو میں لڑوں گا۔ راجہ کو مت بتاؤ کہ میں ارجن ہوں۔ جب مہاراج یدھشٹر مناسب خیال کریں گے خود بتائیں گے" جب جنگ ختم ہوئی کوروں کو بھی معلوم ہو گیا کہ پانڈو وراٹ کے پاس ملازم ہیں اور اس کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔ اس وقت تیرھواں سال گزر چکا تھا۔

جب وراٹ کی فتح کی خبر پہنچی تو وہ یدھشٹر کے ساتھ پانسہ کھیل رہا تھا اس نے اتر کی شجاعت کی تعریف کی یدھشٹر نے کہا "درہنال جس کے ساتھ ہو اس کی فتح میں شک نہیں ہو سکتا" راجہ نے کہا "درہنال تو رتھ بان ہے فتح اتر کے زور بازو اور لیاقت کا نتیجہ ہے" یدھشٹر نے کہا "راجہ درہنال جس کے ساتھ ہو اُسے شکست نہیں ہو سکتی" جب بار بار اس نے درہنال کی تعریف کی تو راجہ کو طیش آیا۔ اس نے کہا "تو برہمن ملازم ہو کر بے باکانہ بکواس کرتا ہے" یہ کہہ کر ایک نرد اس کے مُنہ پر اس زور سے ماری کہ اُس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ سرندھری کے پاس کٹورہ تھا۔ اس نے نیچے رکھ دیا تاکہ خون نیچے نہ گرے۔ اتر آیا اور یہ حال دیکھ کر اُس نے راجہ سے سبب پوچھا راجہ نے کہا "میں تمہاری تعریف کرتا تھا اور یہ نابکار برہمن اس ہیجڑے کی تعریف کرتا تھا۔ اسے اور سخت سزا ملنی چاہیے لیکن میں معاف کرتا ہوں" اس نے کہا "مہاراج آپ نے غلطی کی آپ برہمن سے معافی مانگیں۔ فتح درحقیقت میری ہمت سے نہیں ہوئی" راجہ نے معافی مانگی۔ کنک (ارجن) نے کہا "میں تو تم کو معافی مانگنے سے پہلے ہی معاف کر چکا ہوں غصہ میری طبیعت میں نہیں مگر خیر گزری کہ میرا خون زمین پر نہیں گرا نہ تیرے

دن انہوں نے لباس بدلے اور شان و شوکت سے دربار کے کمرے میں جا بیٹھے۔ یدھشٹر تخت پر بیٹھ گیا۔ دراٹ آیا اور انہیں اس حالت میں دیکھ کر سخت ناراض ہوا۔ یدھشٹر کی طرف دیکھ کر بولا "نالکار تم یہاں کس طرح بیٹھے؟ تم اس تخت کے لائق اپنے آپ کو کیونکر سمجھنے لگے؟ بھیک منگا برہمن اور یہ گستاخی؟" ارجن نے ہنس کر کہا "بے شک! بے شک!! یہ تخت اس شخص کے لائق نہیں" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے آپ کو ظاہر کیا۔ راجہ نے معافی مانگی اور کیچک کی شیطنت پر پشیمانی ظاہر کی۔ جب یہ خبر ہر طرف پھیل گئی تو پانڈوں کے دوست ان سے ملنے کے لئے وہاں آئے اور انہیں دیکھ کر پرماتما کا شکر بجا لائے۔ سلطنت کے خیر خواہوں نے درہودھن کو سمجھایا کہ اب پانڈوں کے ساتھ صلح رکھے اور آدھا راج انہیں بانٹ دے مگر اس نے ایک نہ سنی۔ کرشن جی اس کے پاس ایلچی ہو کر گئے۔ انہوں نے بھی اس کی پچھلی زیادتیاں بیان کیں اور صلح کی سفارش کی مگر ان کے الفاظ کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔

کنتی کا پیغام یدھشٹر کو

جب کرشن جی واپس جا رہے تھے۔ رستہ میں اپنی پھوپھی کنتی سے ملے وہ پانڈو کے ایام بن باس میں ودر کے گھر میں رہتی تھی۔ اس نے کہا "جب ودرکا لڑکا میدان جنگ سے بھاگ کر گھر آکر لیٹ گیا تو اس کی ماں ودولا نے اس سے یہ الفاظ کہے تھے۔" ڈرپوک لڑکے! اٹھو۔ تمہاری حالت دیکھ کر فقط تمہارے دشمن ہی خوش ہو سکتے ہیں جس شخص میں جرات نہیں اسے زندگی سے مایوس ہو جانا چاہیئے۔ اٹھو اور اپنی طاقت کو کم مت سمجھو۔ تھوڑے پر قناعت مت کرو۔ کتے کی موت مرنے سے تو بہتر ہے کہ جا کر سانپ کے منہ میں ہاتھ ڈال دو۔ بہت عرصہ تک سلگتے رہنے سے یہ بہتر ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے بھڑک اٹھو اور اپنی طاقت دکھاؤ یا اپنا فرض ادا کرتے ہوئے مر جاؤ۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو زندگی کی کیا ضرورت ہے"۔ لڑکے نے کہا "ماں کیا تم چاہتی ہو کہ میں مر جاؤں؟ میرے بغیر کیا کرو گی؟" ودولا نے کہا "احمق جب تم اپنی ماں اور بیوی کو دربدر بھیک مانگتے دیکھو گے تو زندگی تم پر وبال ہو جائے گی"۔ ودولا کے الفاظ نے

اثر کیا۔ لڑکا جا کر لڑا اور کامیاب ہوا۔ تم بھی جا کر یدھشٹر سے کہو کہ میرے لئے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یدھشٹر اور ارجن جیسے میرے بیٹے موجود ہیں اور میں روٹی کے لئے دوسروں کی دست نگر ہوں۔

جنگ جنگ شروع ہوئی۔ دونوں طرف سے فوجیں جمع ہوئیں۔ عین لڑائی کے وقت ارجن کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ اس نے اپنے سامنے اپنے رشتہ دار اور دوست دیکھے۔ کرشن سے کہا "بھائی یہ بدقسمتی ہے کہ ہماری تلواروں کے لئے ہمارے بھائی بندوں کے جسم یہاں بنتے ہیں۔ میں ایسے مقابلہ کے لئے تیار نہیں" اس وقت کرشن نے ارجن کو اپدیش دیا کہ فرض کا ادا کرنا ہمارا سب سے اعلیٰ مقصد ہے۔

فرض کی ادائیگی میں دوستی اور رشتہ داری کے خیال بالکل بے تعلق خیال ہیں کرشن جی کا یہ اپدیش ہی بھگوت گیتا ہے جسے ہر روز لاکھوں ہندو اپنی نجات کے لئے سنتے ہیں۔

یدھشٹر رتھ سے اترا اور سیدھا مخالف لشکر میں چلا گیا۔ لوگ حیران تھے۔ وہ بھیشم کے قدموں پر گر پڑا اور کہا "قابل تعظیم دادا۔ آپ دریودھن کی طرف سے لڑتے ہیں ہمیں بھی اجازت دیں کہ ہم آپ کے ساتھ لڑیں" بھیشم نے اجازت دی۔ اسی طرح اس نے درونا چارج اور دیگر بزرگوں سے اجازت لی اور واپس ہوا۔ لڑائی شروع ہوئی اور اٹھارہ روز تک جاری رہی۔ ہزاروں آدمی کٹ مرے۔ پانڈوں کی فتح ہوئی۔ دریودھن بھاگ کر ایک تالاب میں جا چھپا۔

پانڈوں نے اسے وہاں جا پکڑا۔ دریودھن نے کہا "مجھے تنگ مت کرو۔ مجھ میں اب راج کی ہوس باقی نہیں۔ جاؤ میں تمہیں راج دیتا ہوں" یدھشٹر نے کہا "بزدل! معمولی چیزیں مانگنے سے نہیں ملتیں۔ راج کون دے سکتا ہے۔ ہم راج چھین کر لیتے ہیں گداگری نہیں کرتے۔ آ نکل اور جس سے چاہے مقابلہ کر" مقابلہ میں دریودھن ہار گیا یدھشٹر فرمانروا ہوا اور شان و شوکت سے راج کرتا رہا۔ کچھ سالوں کے بعد اس نے

کہا" مجھے اب بان پرست لینا چاہیئے۔ وقت آ گیا ہے کہ میں دنیاوی جھنٹوں سے آزاد ہو جاؤں" لوگوں نے بہتیرا روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ پریکشت کو تخت پر بٹھا کر پانڈو اور دروپدی پھر جنگلوں میں بان پرستی بن کر چلے گئے۔

مہابھارت سے سنہری بچن

جو ہونا تھا سو ہو گیا ہے اور تم اپنا طریق عمل بدلتے ہو۔ پانی بہہ گیا ہے اور تم اب بند باندھنے کی فکر کرتے ہو۔ تمہارے مکان کو آگ لگ گئی ہے اور تم اب پانی کے لئے کنواں کھودنے لگے ہو۔

عقل مند کون ہے؟ وہ شخص جو شیخ چلی کے سے ارادے نہیں کرتا۔ جو پچھلے نقصان کو یاد کر کے نہیں روتا جو مصیبتوں کے نیچے گر کر مر نہیں جاتا۔

جنگل کاٹے جائیں تو شیروں کو شکاری فوراً مار سکتے ہیں۔ شیر مارے جائیں تو جنگلوں کو لوگ کاٹ لیتے ہیں۔ جنگلوں کو چاہیئے شیروں کو پناہ دیں اور شیر ان کی رکھشا کریں گے۔

چھوٹا دشمن بھی حقیر نہیں۔ ذرا سی آگ سارے شہر کو خاک سیاہ کر دیتی ہے کھشتری کا فرض ہے کہ مشکلات کے سامنے سیدھا رہے۔ اگر طاقت نہ ہو تو ٹوٹ جائے لیکن جھکے نہیں۔

سقراط

(از لالہ دیوان چند جی ایم۔ اے)

مختصر حالات زندگی

سنہ ۴۶۹ قبل مسیح میں ایٹیکا کے ایک گاؤں میں سقراط پیدا ہوا۔ اس کے بت تراش باپ اور

اس کی دایہ ماں کو کبھی گمان تک نہیں ہوا ہوگا کہ ان کا لڑکا شہرت کے آسمان پر روشن ستارہ نہیں بلکہ سورج ہو کر چمکے گا۔ اس کی قابلیت سے نہ فقط ان کے خاندان بلکہ ان کے شہر، صوبہ اور ملک کی عزت میں اضافہ ہوگا۔

سقراط کے باپ نے اپنی طرح بیٹے کو بھی بت تراشی کے کام میں لگایا۔ سقراط کی طبیعت نے اس کام کو پسند نہ کیا۔ جب کبھی مجبور ہوتا تھوڑی دیر کے لئے وہ اس کام کو ہاتھ میں لے لیتا مگر اس کے وقت کا بڑا حصہ فلسفہ کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا۔ مختلف اُستادوں سے اُس نے وہ علم حاصل کئے جو اس زمانہ میں ایسی چھوٹی جگہ حاصل ہونے ممکن تھے۔ اس وقت بھی اس کی غیر معمولی ذہانت کو دیکھ کر اس کے اُستاد اور دوسرے لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ تحقیقِ حق اس کی زندگی کا مدعا تھا۔ اس مدعا کو لے کر وہ ایتھنز میں آیا۔

اس وقت ایتھنز اور سپارٹا کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ سقراط کی خدمات کی اُس کے ملک کو ضرورت ہوئی اور اس نے سپاہیانہ زندگی اختیار کی۔ سخت موسم سرما میں جبکہ اور سپاہی گرم کپڑے پہنے ہوئے کانپتے تھے سقراط معمولی کپڑوں میں آرام سے گزارتا تھا۔ جہاں اور سپاہی بھاری جوتوں کی وجہ سے چلنے میں دقت محسوس کرتے تھے وہاں سقراط ننگے پاؤں برف پر بآسانی بھاگا جاتا تھا۔ زندگی کے اس حصہ میں سقراط کی جسمانی طاقت ایسی تھی کہ وہ دوسروں سے بدرجہا بہتر سردی و گرمی کو برداشت کر سکتا تھا۔ سخت سے سخت بھوک اس پر قادر نہیں تھی۔ جرأت اور حوصلہ میں اس کا ثانی مشکل سے ملتا تھا۔ تکلیف کے وقت کبھی اس کے اوسان خطا نہیں ہوئے سقراط کی زندگی کا بہت سا حصہ تقریباً ساری زندگی لوگوں کی تعلیم میں گزری اس کے لئے ضروری نہیں تھا کہ وہ کرسی پر ہو اور پڑھنے والے سامنے بنچوں پر باادب بیٹھے ہوں۔ کھاتے، پیتے اور کھیلتے خواہ وہ بازار میں ہوتا یا باہر سڑکوں پر۔ ہر وقت اور ہر حال میں جب کوئی شخص اس کے پاس ہوتا۔ اُس کی بہتری کے لئے وہ اُسے کچھ نہ کچھ سکھاتا رہتا تھا۔ گاؤں میں اور جنگلوں میں اُسے پھرنے کا شوق نہیں تھا بلکہ انسانوں

سے مل کر اُسے راحت ہوتی تھی۔ وہ انسانوں کی صحبت کا ہر وقت بھوکا اور پیاسا تھا۔ ہر ایک شخص اس کی صحبت سے فیض یاب ہوتا تھا۔ باقاعدہ تعلیم کا کام اُس نے کبھی نہیں کیا لیکن ہر روز وہ دن چڑھتے ہی پبلک سیر گاہوں۔ اکھاڑوں یا مدرسوں میں چلا جاتا جس وقت منڈی میں بھیڑ ہوتی اس وقت وہ وہاں ہوتا۔ اس کا تمام دن اس طرح گزر جاتا۔ بچہ ہو یا بوڑھا۔ دولت مند ہو یا غریب جو کوئی سقراط سے بات چیت کرنا چاہتا تھا وہ بخوشی اس کے سوالوں کا جواب دیتا۔ اس کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی مٹھاس تھی اور اس کی تعلیم دانائی کے سبقوں سے پر تھی۔ اس لئے بعض شخصوں نے روزانہ پروگرام بنا لیا تھا کہ ایسے موقعوں پر اس کے ساتھ رہیں اور اس کی گفتگو کو سُنیں۔

سقراط کی عمر ساٹھ برس سے اوپر ہو گی جب اُسے پہلی دفعہ ملک کے ایک سول عہدہ پر مامور ہو کر خدمت کرنے کا موقعہ ملا۔ اس وقت وہ سینیٹ کا ممبر چُنا گیا۔ سینیٹ کے ۵۰۰ ممبر تھے اور ہر ایک اپنی باری پر ایک دن کے لئے پریذیڈنٹ ہوتا تھا۔ جس دن سقراط پریذیڈنٹ تھا اُس دن کئی امیر البحروں کے خلاف مقدمہ پیش تھا کیونکہ انہوں نے ایک جنگ کے موقعہ پر مُردوں کو دفن نہیں کیا تھا۔ امیر البحروں کے دشمنوں نے لوگوں کو بھڑکا دیا تھا اور لوگ دیوانہ وار ایک ہی ووٹ سے سب امیر البحروں کی موت اور ان کے مال کی ضبطی کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے لیکن سقراط نے اُسے خلاف قانون جان کر ایسا ووٹ لینے سے انکار کر دیا۔ لوگوں نے دھمکی دی کہ اگر حاکمانِ وقت ان کی منشار کے مطابق کام نہیں کرتے تو انہیں بھی مجرم ٹھہرایا جائے گا۔ سقراط کے ساتھی اس دھمکی سے ڈر گئے لیکن سقراط نے اپنے حوصلہ کو قائم رکھا اور تمام دھمکیوں کی پروا نہ کر کے اپنی رائے نہیں بدلی اور ووٹ لینا منظور نہ کیا۔

کوئی دس سال کے قریب اور گزر گئے تو سقراط پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ملکی قوانین کو توڑتا ہے۔ کیونکہ ان دیوتاؤں کو جن کو ریاست مانتی ہے وہ تسلیم نہیں کرتا بلکہ نئے دیوتاؤں کو مانتا ہے۔ اس کے علاوہ نوجوانوں کے خیالات خراب کر کے قوانین کو توڑتا ہے

اس الزام پر سقراط کو مجرم ٹھہرایا گیا اور زہر کے پیالہ سے اُس کا کام تمام کیا گیا۔

سقراط اور اکاش بانی

سقراط کے ایک دوست نے مندر میں جا کر پوچھا کہ ہمارے درمیان کوئی شخص سقراط سے زیادہ دانا ہے؟ آکاش بانی نے جواب دیا "نہیں" سقراط اس جواب سے حیران ہوا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس جواب کو سُن کر وہ اس وقت کے مشہور فاضلوں کے پاس گیا۔ اُن سے ان کے اپنے مضمونوں کے متعلق ہی سوال کئے۔ دو چار سوالوں میں ہی انہیں ایسا بیتا کہ وہ مجبور ہو گئے۔ سقراط نے کہا "میں کچھ نہیں جانتا اور ایسے ہی اور لوگ بھی کچھ نہیں جانتے لیکن مجھے اپنی لاعلمی کا علم ہے۔ دوسروں کو اس کا علم نہیں۔ اس وجہ سے آکاش بانی نے مجھے سب سے سیانا کہا ہے"۔

سقراط کا طرز تعلیم

نرالا تھا۔ اس کے غالباً دو سبب تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس لئے وہ دعوے سے کوئی تعلیم نہیں دیتا تھا۔ دوسرے وہ سمجھتا تھا کہ انسانی فطرت میں غرور بھرا ہے اور کوئی شخص خوشی سے شاگردی کی حیثیت قبول نہیں کرتا۔

سقراط کی تعلیم سوال و جواب کی شکل میں ہوتی تھی۔ سوال عموماً سقراط کی طرف سے ہوتے تھے اور جواب دوسرے آدمی کی طرف سے۔ اس طرح سقراط جو کچھ سکھانا چاہتا تھا دوسرے کے مُنہ سے ہی کہلواتا تھا۔ دوسرا آدمی کچھ سیکھ بھی لیتا تھا اور اسے اپنی عقل کی کمزوری کا بھی خیال نہیں ہوتا تھا۔ جو شخص اپنے آپ کو دانا سمجھتے تھے ان کے ساتھ سقراط کا برتاؤ مختلف تھا۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو ہمہ دان سمجھ کر کسی مسئلہ کا پرچار کرتا تو سقراط اس کے پاس بڑے مودبانہ طریق سے جا کر کھڑا ہوتا اور اس سے ایک معمولی سوال کرتا جس کا صاف جواب اسے فوراً آل جاتا۔ اس سوال کے متعلق وہ دوسرا سادہ سا سوال کرتا اور جواب لیتا۔ اسی سوال و جواب کے سلسلہ میں مخالف جھمیلے سے نکلنے کے ناقابل ہو جاتا تھا اور اس کے خیالات کی وقعت خود اسے بھی معلوم ہو جاتی تھی۔

سقراط نے کبھی تعلیم دیتے وقت ترش روئی اختیار نہیں کی بلکہ وہ ہمیشہ خندہ پیشانی

رہتا تھا اور ہنسی ہنسی میں دوسروں کو سکھا دیتا یا ان کی بیہودگی جتا دیتا تھا۔

ایک نوجوان گلاکن نامی نے بیس برس کی عمر سے پہلے ہی خواہش کی کہ ریاست کا پریسیڈنٹ بن جائے۔ اس کے رشتہ داروں نے اسے اس حماقت سے روکنے کی کوشش کی اور چاہا کہ وہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو ذلیل نہ کرے لیکن گلاکن بضد تھا سقراط کو گلاکن سے ہمدردی تھی جب اسے اتفاق سے ایک دن ملا تو ان کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی۔

سقراط۔ گلاکن میں سنتا ہوں تم ریاست کا پریسیڈنٹ بننے کی کوشش کر رہے ہو؟

گلاکن۔ ہاں کر تو رہا ہوں۔

سقراط۔ پریسیڈنٹ کا عہدہ نہایت ہی معزز ہے۔ اگر تم اس میں کامیاب ہو جاؤ تو تم نہ فقط اپنے دل کی خواہشیں ہی پوری کر سکو گے بلکہ اپنے دوستوں کے بھی کام آسکو گے۔ تم اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔ تمہارا اپنا نام شہرہ آفاق ہو گا ہر کوئی تمہاری تعریف کرے گا۔

گلاکن۔ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

سقراط۔ لیکن گلاکن! اگر تم عزت چاہتے ہو تو ریاست کو تم سے فائدہ پہنچنا چاہیئے۔

گلاکن۔ اس میں کیا شک ہے۔

سقراط۔ کیا ریاست کی ترقی کے لئے ریاست کی دولت کا بڑھنا ضروری نہیں اور کیا ریاست کی دولت ریاست کے محاصل سے نہیں بنتی؟

گلاکن۔ کوئی سمجھدار آدمی اس میں شک نہیں کر سکتا۔

سقراط۔ آج کل ریاست کا محصول کیا ہے اور کن کن صیغوں سے یہ وصول ہوتا ہے

گلاکن۔ ابھی تک مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ ان مدوں کا مطالعہ کروں یا اس معاملہ پر غور کروں۔

سقراط۔ اچھا فی الحال اسے جانے دو۔ کم از کم یہ تو تمہاری خواہش ہو گی کہ بیفائدہ اخراجات دور کئے جائیں۔ آج کل ریاست کا خرچ کیا ہے؟

گلاکن۔ اس کی طرف خیال کرنے کی مجھے کبھی فرصت نہیں ہوئی۔

سقراط۔ ہیں! اچھا۔ فی الحال اسے بھی جانے دو۔ ہماری ریاست کی طاقت کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے مخالف ہم سے زبردست نہ ہوں بلکہ ہماری طاقت ان سے بڑھے۔

گلاکن۔ یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔

سقراط۔ آج کل ہماری ریاست کی بحری اور بری طاقت کیا ہے؟ اور ہماری مخالف ریاستوں کی کیا ہے؟

گلاکن: میں نے ابھی تک اس طرف خیال نہیں کیا۔

سقراط نے اور کئی سوال کئے تو گلاکن کو معلوم ہو گیا کہ جس ریاست کا وہ پریسیڈنٹ بننا چاہتا ہے اس کے کسی ضروری معاملہ کے متعلق اُسے واقفیت نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

سادہ پن اور جفاکشی

سقراط کی زندگی میں سادگی اور جفاکشی کی خوبیاں نمایاں تھیں۔ جب اُسے بھوک لگتی تھی تب کھانا کھاتا تھا اس لئے اُسے ہر قسم کی خوراک کا مزہ آتا تھا۔ پیاس کے بغیر وہ کچھ پیتا نہیں تھا۔ اس لئے پانی پی کر اس کو حظ حاصل ہوتا تھا۔ وہ اتنے تھوڑے خرچ پر گذارہ کر سکتا تھا اور کرتا تھا جتنا غریب سے غریب آدمی کما سکتا ہے بشرطیکہ وہ محنت کرنے پر راضی ہو۔

ایک موقعہ پر انٹی فونامی ایک شخص نے سقراط کے شاگردوں کو اس سے متنفر کرنے کے لئے اس سے کہا "سقراط! میں سمجھتا تھا کہ آدمی فلسفہ کے مطالعہ سے زیادہ آنند حاصل کرتا ہے لیکن تمہاری حالت دیکھ کر میری رائے بدل گئی ہے۔ پڑھ پڑھ کر تمہاری حالت ایسی خراب ہو گئی ہے کہ ایک غلام بھی ایسی حالت میں رہنا گوارا نہیں کرے گا۔ تمہارا کھانا پینا بہت ادنےٰ قسم کا ہے۔ تمہارا لباس خراب ہے۔ گرمی سردی میں تم ایک ہی

کپڑے پہنتے ہو۔ جوتی تم نہیں پہنتے۔ کوٹ تمہارے جسم پر نہیں ہوتا اور شاگردوں سے
تم تعلیم کے عوض کچھ لیتے نہیں۔ اگر تم فیس لے لیا کرو تو تم اپنی حالت کو بہتر بنا سکتے ہو
اگر تمہاری تعلیم اور تمہارا عمل ایک ہیں تو یقین جانو کہ تم مصیبت کا پرچار کر رہے ہو"
سقراط نے جواب میں کہا "انٹی فو! تمہارے خیال میں میری زندگی ایسی ذلیل
ہے کہ تم ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہو مگر جہاں تنخواہ دار استاد فیس دینے
والے شخصوں کو پڑھانے پر مجبور ہیں وہاں کی مصیبت کو تم نہیں سمجھتے۔ میں مختار
ہوں جس کو چاہوں تعلیم دوں اور جس کو چاہوں نہ دوں کیا تم اس کو مصیبت سمجھتے
ہو کہ میری خوراک معمولی ہوتی ہے اور اتنی مزے دار نہیں جتنی تمہاری خوراک ہوتی
ہے؟ یاد رکھو! جس شخص کا کھانا لذیذ ہے اس کو چٹنی کی ضرورت نہیں۔ جس کو اپنے
کھانے پینے کی چیزیں بھاتی ہیں اُسے اور چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گرمی اور
سردی میں لوگ مختلف کپڑے پہنتے ہیں کیونکہ ان کے جسم سردی اور گرمی کو یکساں
برداشت نہیں کر سکتے۔ لوگ پاؤں ننگے نہیں رکھتے کیونکہ ان کے پاؤں کو چوٹیں لگتی
ہیں۔ میں آزاد ہوں۔ میں نے اپنے جسم کو ایسا بنا لیا ہے کہ مجھے سردی گرمی میں کوئی دقت
محسوس نہیں ہوتی۔ ننگے پاؤں چلتا پھرتا اور بھاگتا ہوں۔ لڑائی میں میں نے گرمی۔
سردی کی تکلیف کبھی محسوس نہیں کی۔ جوتوں کی ضرورت مجھے کبھی محسوس نہیں ہوتی
تم لوگ ایسی زندگی کی قیمت کیا جان سکتے ہو؟"
سقراط میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جفاکش تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہر ایک انسان کو
دنیا میں کام کرنا ہے۔ دنیا میں کامیابی ان لوگوں کو نصیب نہیں ہو سکتی جو گڑیا بن کر
رہنا چاہتے ہیں۔ وہ شخص زندگی کی تکلیفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو ایک دن حسب معمول
خوراک نہ ملنے سے گھبرا جاتے ہیں یا جن کو ایک رات سونا نصیب نہ ہو تو ہمت ہار بیٹھتے
ہیں۔ اگر انسان خواہشات کا غلام ہے اور عیش و عشرت میں پھنسا ہوا ہے تو وہ برائے
نام انسان ہے۔ اس کی صفات حیوانی صفات ہیں۔ جو شخص اپنے آپ پر حکومت نہیں
کر سکتا وہ اوروں پر کیسے حکومت کر سکتا ہے۔ سقراط کی رائے میں سستی اور نفس

پروری سے نہ تو جسم کی صحت اور چستی حاصل ہوتی ہے۔ نہ دماغ ہی منور ہو سکتا ہے لیکن اگر انسان باقاعدہ کوشش کرے اور جفاکشی کی عادت ڈالے تو وہ نیکی کی راہ پر چلنے کے قابل بن سکتا ہے۔ جیسا کہ ایک پرانے مصنف نے کہا ہے "بدکاری ہر کہیں موجود ہے اور چھپی ہوئی نہیں۔ بدکاری تک ہم آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بالکل ہمارے پاس ہے لیکن نیکی اور عصمت کے مندر کے آگے دیوتاؤں نے مشقت کو متعین کر دیا ہے۔ عصمت کے مندر تک راہ لمبی۔ ناہموار اور ڈھلوان ہے لیکن جب چوٹی تک پہنچ جاؤ تو پہلے جو راستہ کھردرا تھا وہ صاف اور ہموار بن جاتا ہے"۔

سقراط کی تعلیم

اکثر اخلاقی ہوتی تھی۔ جس شخص کا کام عمر بھر اخلاقی تعلیم دینا رہا ہو اور جس کی عمر ستر سال سے زیادہ ہو اس کی تعلیم کا اختصار سے بھی اس مختصر تذکرے میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ مجبوراً دو چار امور پر اس کی رائے ظاہر کرنے پر کفایت کرتا ہوں۔

اعتدال اور میانہ روی

اعتدال اور میانہ روی انسان کے زیور ہیں۔ آزادی کی حالت غلامی سے بہتر ہے۔ غلامی خواہ بیرونی جبر اور دباؤ کا نتیجہ ہو خواہ اپنی عادات کا۔ ہر حالت میں بری ہے۔ انسان کے لئے یہ شرمناک کمزوری ہے کہ نفسانی خواہشات کی غلامی کے سبب سے وہ ایسے کام کرنے کے ناقابل ہو جنہیں وہ کرنا چاہتا ہے۔ کھانے پینے میں اعتدال بڑا ضروری ہے۔ بہت سی بیماریوں کی دوا خوراک میں اعتدال اور پرہیز ہے اگر انسان اعتدال اور میانہ روی کی پروا کرے تو اس کا جسم درست حالت میں رہتا ہے۔ انسان کے لئے یہ شرمناک فعل ہے کہ بے پروائی کی وجہ سے قبل از وقت بوڑھا ہو جائے اور یہ نہ دیکھ سکے کہ اگر اس کا جسم صحیح و سالم رہتا تو وہ کیا کچھ بن جاتا۔

مفت تعلیم

سقراط تعلیم کے عوض میں اپنے شاگردوں سے کچھ فیس وصول نہیں کرتا تھا۔ اس کی ایک وجہ آگے ہم بیان کر چکے ہیں۔ وہ آزاد رہنا چاہتا تھا اور فیس نہ لینے سے وہ اپنے آپ کو بالکل آزاد

سمجھتا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ قوی دلیل یہ تھی کہ اس کے خیال میں تعلیم دینے سے انسان ہم جنسوں کی روحوں کو سنوارتا ہے اور اس کی کوئی قیمت مقرر نہیں ہو سکتی علاوہ اس کے دوسرے آدمی کی روح کو بہتر بنانے میں جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ روپیہ پیسہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ جب ایک شخص دوسرے کو تعلیم دیتا ہے تو دونوں فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ان کے تعلقات دوستانہ ہوتے ہیں اور دنیا میں دوستوں کا حاصل کرنا ایسی کامیابی ہے جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ لوگ مکانوں کی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں دولت جمع کرنے کی دھن میں نیکی بدی میں تمیز نہیں کرتے۔ طاقت حاصل کرنے کے لئے سر توڑ کوشش کرتے ہیں لیکن شاذ و نادر ہی ان میں اچھے وفادار دوستوں کے حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جس شخص کا کوئی سچا دوست نہیں وہ سب کچھ رکھتے ہوئے بھی نادار ہے اور اپنی حشمت اور دبدبے کے باوجود بھی بے حیثیت ہے۔ جس شخص کو خوش قسمتی سے سچے دوست مل گئے ہیں۔ وہ ناداری کی حالت میں بھی امیر ہے۔ دنیا کے لوگ خواہ اسے کمزور سمجھیں لیکن اس کی طاقت بڑی ہے سقراط سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ اگر ایک سچا دوست دنیاوی جاہ و حشمت اور مال و دولت سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے حاصل کرنے کی کوشش ایک اعلیٰ غرض ہے تو معلوم ہونا چاہیئے کہ سچے دوست کے اوصاف کیا ہیں۔

سقراط نے جواب میں کہا:-

اوّل وہ شخص دوستی کے لائق نہیں جو بسیار خواری، کثرت شراب نوشی۔ عیاشی اور سستی میں پھنسا ہو۔ جو شخص ان برائیوں کا غلام ہے وہ نہ تو اپنی فکر کر سکتا ہے نہ اوروں کے کام ہی آسکتا ہے۔

دوسرے وہ شخص دوستی کے لائق نہیں جو فضول خرچ ہے۔ فضول خرچی کی وجہ سے انسان کی آزادی قائم نہیں رہتی بلکہ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں سے روپیہ مانگتا رہتا ہے۔ جو اُسے اودھار نہیں دیتے انہیں کو ستاتا رہتا ہے۔

تیسرے وہ شخص دوستی کے لائق نہیں جسے دولت جمع کرنے کی اتنی دھن

لگی ہے کہ اُسے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

چوتھے وہ شخص دوستی کے لائق نہیں جو لڑاکا ہے اور دوسروں میں فساد اور عداوت ڈالنے کی خواہش کرتا ہے۔

پانچویں وہ شخص دوستی کے لائق نہیں جو دوستوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے لیکن انہیں فائدہ پہنچانے کی پرواہ نہیں کرتا۔

الغرض وہ شخص دوستی کے لائق ہے جو جسمانی خوشیوں میں اعتدال سے کام لیتا ہے اور اپنے بیوہار میں سچا اور ایماندار ہے۔ جسے فکر لگی رہتی ہے کہ جتنا نفع دوستوں سے اس کو پہنچتا ہے اس سے زیادہ فائدہ وہ ان کو پہنچائے۔

کام کی قیمت

سقراط کے پاس آکر ارسٹارکس نے شکایت کی کہ آج کل میری حالت خراب ہے۔ آمدنی قلیل ہے اور خرچ زیادہ خاص وجوہات سے کئی بھتیجے بھتیجیاں آج کل میرے گھر میں آئے ہیں۔ ۱۴ آدمی اس وقت موجود ہیں۔ خرچ بہت بڑھ گیا ہے کوئی تدبیر ہو تو بتاؤ کہ رہائی ہو۔

سقراط نے پوچھا "بھتیجے بھتیجیاں اور گھر کے آدمی کیا کام کرتے ہیں؟" جواب ملا "وہ غلام تھوڑے ہیں جو کام کریں"۔ سقراط نے کہا "اگر غلام کام کر کے روٹی کما سکتے ہیں تو شرم کا مقام ہے کہ بعض آزاد آدمی کام کر کے روٹی نہیں کما سکتے۔ جاؤ اپنے رشتہ داروں کو کام کرنے کی تلقین کرو۔ ان سے کام لو۔ اگر تھوڑی سی توجہ اس طرف کرو تو ان کے کام کی اُجرت اُن کے خرچ کے لئے کافی ہوگی۔ ایسی حالت میں نہ تم اُن سے بیزار ہوگے۔ نہ وہ تم سے نظر چرائیں گے۔" وہ شخص گھر گیا اور سب رشتہ داروں کو بُننا سینا۔ پرونا اور دیگر ایسے کام دے دیئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کام کی برکت سے گزارا آسانی سے ہونے لگا اور کام سے نفرت کرنے کی جگہ وہ سب لوگ کام سے محبت کرنے لگے۔ چونکہ باقی گھر والے محسوس کرنے لگے کہ ارسٹارکس نکھٹو ہے اور یہ خیال ظاہر بھی کر دیا۔ ارسٹارکس سقراط کے پاس آیا اور اس سے یہ ماجرا بیان کیا۔ سقراط نے کہا "جا کر یہ کہانی گھر سنا دو یقیناً ان کی تسلی ہو جائے گی۔"

جب حیوان بات چیت کر سکتے تھے بھیڑوں نے اپنے مالک سے کہا" مالک! تم عجیب آدمی ہو۔ ہم تمہیں اون۔ بچے اور دودھ دیتے ہیں۔ تم ہمیں کچھ نہیں دیتے۔ ہم خود ہی زمین سے چر چگ لیتے ہیں۔ تمہارا کتا تمہیں کچھ نہیں دیتا لیکن اُسے تمہارے کھانے سے حصہ ملتا ہے"۔ مالک نے جواب دیا" لیکن یہ عین انصاف ہے۔ میں ہی ہوں جو تمہاری حفاظت کرتا ہوں۔ ورنہ آدمی تمہیں چرالے جائیں یا بھیڑیے کھا جائیں اگر میں تمہاری حفاظت نہ کروں تو تم چر بھی نہ سکو۔ اس ڈر سے کہ کوئی تمہیں مار نہ جائے اور میرا کتا تمہاری حفاظت میں میری مدد کرتا ہے"۔

ہاتھ کی محنت کی طرح سقراط انتظام اور دماغی محنت کو بھی کام سمجھتا تھا۔

کامیابی کا راز

جب تمہیں اوروں کے ماتحت کام کرنا ہو تو خیال رکھو کہ تمہارا افسر محبتی اور نکتہ چین نہ ہو بلکہ درگذر کرنا بھی جانتا ہو۔ ایسے کام کو ہاتھ میں لو جو تم کر سکتے ہو جس کام کی قابلیت تم میں نہیں ہے اُسے اپنے ذمے مت لو۔ جب تم ایک کام کا ذمہ اٹھاؤ تو اپنی ساری طاقت اور پورے جوش سے اس میں لگ جاؤ۔ اگر تم ایسا کروگے تو دوسرے کڑے وقت میں تمہاری مدد کریں گے اور تم قصوروار نہیں ٹھہرائے جاؤگے۔ اس طرح تمہاری زندگی مزے سے گزرے گی اور بڑھاپے کے لئے تمہارے پاس کافی سامان ہوگا۔

سقراط پر الزام

ایسی تعلیم کو اہل یونان نے خطرناک سمجھا۔ اس شخص کو جو سارے ملک کے لئے مایہ ناز تھا اور اس وقت ساری دنیا کے متعدد رتنوں میں سے تھا ملک کا دشمن سمجھا گیا۔ بعض خود غرضوں کے اکسانے پر میلیٹس نامی ایک شخص نے سینیٹ میں ذیل کی عرضی گزرانی۔

"میں میلیٹس سقراط پر الزام لگاتا ہوں کہ وہ قوانین کو توڑتا ہے کیونکہ ان دیوتاؤں کی جگہ جنہیں ریاست مانتی ہے۔ اس نے نئے نئے دیوتا اپنی عبادت کے لئے بنائے ہیں وہ نوجوانوں کو بگاڑتا ہے اور اس طرح بھی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

سقراط نوجوانوں کو سکھاتا ہے کہ وہ اس کی تعلیم سے والدین سے بھی سیانے

ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نوجوان اپنے والدین سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ دانا آدمیوں کے ماتحت اَن پڑھوں کو رہنا چاہیئے اس نے ایک دفعہ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر ایک شخص کا باپ بھی پاگل ہو جائے تو اُسے بند کر دینا جائز ہے اس وقت ریاست کے حکام ووٹوں کے ذریعہ چُنے جاتے ہیں۔ سقراط کہتا ہے کہ یہ رسم نہایت نامعقول اور بیہودہ ہے۔ اگر معمار۔ ملاح اور بنسی بجانے والے کی ضرورت ہو تو کوئی شخص ووٹ نہیں لیتا۔ بلکہ جو شخص ان کاموں کے لئے مناسب ہوتا ہے اُسے مقرر کیا جاتا ہے۔ اگر ایسے انتخابوں میں غلطی بھی ہو جائے تو اتنا نقصان نہیں ہوتا لیکن جہاں انسانوں کے حکام چننے میں ووٹ لئے جائیں وہاں بلاشبہ حماقت کا راجیہ ہے۔ سقراط کی ایسی تعلیم سے نوجوانوں کو ترغیب ہوتی ہے کہ وہ ملک کے قوانین کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں اور قوانین کی خلاف ورزی کریں"۔

جب سقراط پر یہ الزام حلفی بیان سے لگایا گیا تو سماعت مقدمہ کی تاریخ مقرر کی گئی۔ سقراط بالکل اپنی تعلیم و تدریس میں لگا رہا۔ اس کے ایک دوست نے کہا "سقراط عجیب آدمی ہو! تم پر الزام لگایا گیا ہے جو خدانخواستہ ٹھیک ثابت ہو جائے تو تمہاری جان کے لالے پڑ جائیں اور تم بے فکری سے بیٹھے ہو۔ جوابدہی کے لئے تمہیں تیاری کرنی چاہیئے"۔ سقراط نے کہا "میں اسی کو کافی تیاری سمجھتا ہوں کہ میں نے اپنی عمر میں پاپ اور فریب نہیں کیا۔ اس کے علاوہ جب میں ایک موقعہ پر جوابدہی تیار کرنے لگا تو فرشتۂ غیبی نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ شاید میرا مرنا ہی بہتر ہے۔ اس وقت تک میری عمر شانتی سے گزری ہے اور میں لگاتار اخلاقی ترقی کرتا رہا ہوں۔ میرے دوست مجھ سے عزت کے ساتھ برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ اگر میری زندگی منقطع نہ ہو تو بڑھاپا آکر مجھے ستائے گا۔ میرے حواس کام نہیں کریں گے میری فراست میں کمی آجائے گی۔ ایسے حالات میں زندگی کی مجھے چنداں خواہش نہیں۔ نیز اگر اب مجرم گردان کر مجھے مار ڈالا جائے گا تو لوگ ججوں کے فعل کو قابل نفرت خیال کریں گے اور میرے خلاف کوئی اتہام نہیں لگائیں گے۔ بلکہ ممکن ہے کہ

میری موت کی وجہ سے میری عزّت آگے سے بڑھ جائے"

سقراط کا ٹرائل اور اُس کی آخری تقریر

مقدمہ کی سماعت کے دن میلٹس

اور دو اور آدمیوں نے سقراط پر الزام لگایا۔ سقراط نے کسی وکیل کی معرفت پیروی نہیں کی۔ بلکہ خود اپنی جواب دہی کی۔ جواب دہی کے وقت اس کی آواز اور الفاظ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہے اور مہربانی کا خواستگار ہے۔ بلکہ اس کی آزادی۔ استقلال اور عصمت عیاں تھی۔ اس کے کئی دوستوں نے بھی اس کے حق میں تقریریں کیں۔ افلاطون جو اُس وقت نوجوان تھا تقریر کرنے اٹھا اور جب اپنی نوجوانی کے متعلق عذر خواہی کر رہا تھا عدالت نے اسے بٹھا دیا۔ سقراط کے متعلق ووٹ لئے گئے اور پانچ سو میں سے ۲۸۱ شخصوں نے اُسے مجرم ٹھہرایا۔ اس وقت رواج تھا کہ ایسے جرموں کے لئے کچھ جرمانہ لے کر مجرم کو معاف کیا جاتا تھا۔ سقراط سے کہا کہ وہ اس انتظام سے فائدہ اٹھائے اور جرمانہ دے کر معافی حاصل کرے۔ سقراط نے جواب دیا۔" روپیہ دینے کے معنے یہ ہیں کہ میں بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھتا ہوں۔ میں نفرت سے اس کو نامنظور کرتا ہوں" جب سقراط کی موت کا فتویٰ دیا گیا تو اس نے ذیل کی آخری تقریر کی۔

"ایتھنز کے رہنے والو! تھوڑے دنوں کی بات تھی ناحق تم نے اپنے شہر کے دشمنوں کو الزام لگانے کا موقعہ دیا ہے کہ تم نے سقراط کو مار دیا۔ اگر تم تھوڑی دیر انتظار کرتے تو یوں ہی میں موت کا شکار ہو جاتا۔ میری موت کے متعلق ووٹ دینے والو! تم شاید خیال کرتے ہو کہ کم لیاقتی کی وجہ سے میں تمہارے دلوں کو تسخیر نہیں کر سکا اور اس لئے مرتا ہوں۔ نہیں نہیں۔ تم غلطی پر ہو۔ مجھ میں یہ طاقت تھی کہ تمہارے دلوں کو تسخیر کر لیتا لیکن اس کے لئے مجھے وہ باتیں کہنی پڑتیں جو تمہیں بھاتی ہیں۔ دوسرے لوگ تمہیں خوش کرنے کے لئے سب کچھ کہہ لیتے ہیں اور کر لیتے ہیں لیکن میں وہی کہہ اور کر سکتا ہوں جو ایک آزاد آدمی کے شایاں ہے اور جو میرا فرض ہے۔ جس طریق سے میں نے

اپنی جواب دہی کی ہے اس کا مجھے اب بھی کوئی افسوس نہیں۔

میرے ہموطنو! نہ عدالت کے کمرہ میں اور نہ میدان جنگ میں ہی ہماری یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ خواہ کچھ ہی ہو جائے ہماری جان بچ جائے لڑائی میں کئی موقعہ ایسے آتے ہیں کہ اگر آدمی ہتھیار ڈال دے اور اپنے مخالف سے ہاتھ جوڑ کر رحم کی درخواست کرے تو اس کی جان بچ سکتی ہے لیکن ایسا کرنا روا نہیں۔ باقی خطروں میں بھی اگر انسان سب کچھ کرنے پر تیار ہو جائے تو وہ بچ سکتا ہے۔

ایتھنز کے رہنے والو! موت سے جان بچا لینا مشکل نہیں مشکل یہ ہے کہ انسان گناہ سے پاک رہے گناہ موت سے تیز چلتا ہے میں اب بوڑھا ہوں اور آہستہ چل سکتا ہوں مجھے موت نے جو آہستہ چلتی ہے آپکڑا ہے میرے الزام لگانے والوں کو جو اب طاقتور اور تیز رو ہیں تیز رو پاپ نے آگھیرا ہے ہم سب یہاں سے جاتے ہیں مجھ پر تم نے موت کا فتویٰ دیا ہے اور ان پر سچائی نے پاپ اور بے انصافی کا جرم لگایا ہے میں اپنی سزا کو سر آنکھوں پر قبول کرتا ہوں وہ اپنی سزا کو مجھ پر موت کا فتویٰ دینے والو! میں اب ایک پیشین گوئی کرنا چاہتا ہوں۔ جو سزا تم نے مجھ کو دی ہے اس سے بڑی سزا تم کو میری موت کے پیچھے ملے گی تم سمجھتے ہو کہ مجھے مار کر تم چین سے زندگی گزارو گے اور کوئی شخص تم سے تمہاری زندگیوں کے لئے جواب طلب نہیں کرے گا لیکن میں کہتا ہوں کہ بہت سے لوگ جن کو تم نے دیکھا تک نہیں اور جن کو میں نے روک کے رکھا ہے تم سے جواب طلب کریں گے ان میں جوانی کا خون ہوگا وہ تم کو دکھ دیں گے اور تم زیادہ دق ہو گے بعض لوگ تمہاری خراب اور گندہ زندگیوں پر اعتراض کرتے ہیں، اگر تم خیال کرتے ہو کہ ان لوگوں کو مار کر تم ان کی زبان بند کر سکتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اس طرح نہ تم اپنی حفاظت کر سکتے ہو اور نہ یہ شریفانہ طریق ہی ہے۔ آسان اور شریفانہ طریق یہ ہے کہ لوگوں کے گلے کاٹنے کی جگہ اپنی زندگیاں سدھارو

ایک درخواست مجھے تم سے کرنی ہے کہ اگر جوان ہو کر میرے لڑکے اخلاقی پروا نہ کرتے ہوئے دولت یا کسی اور چیز کی خواہش کریں تو انہیں دکھ دو جس طرح میں نے تمہیں دکھ دیا ہے۔ اگر وہ حقیقت میں ناکارہ ہوں اور باوجود اس کے مغرور ہوں تم ان کو لعنت ملامت کرو۔ جیسے میں تمہیں کر رہا ہوں۔ اگر تم یہ کرو گے تو ہماری طرف جو تمہارا فرض ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ اب وقت ہے کہ ہم یہاں سے چل دیں میں مرنے کے لئے اور تم زندہ رہنے کے لئے لیکن پرماتما ہی کو معلوم ہے کہ ہم میں سے کس کے مقسوم بہتر ہیں۔"

سقراط کی قید اور موت۔ جب یہ تقریر ختم ہو چکی تو سقراط کو قید خانہ میں لے گئے۔ اس وقت وہ جگہ ذلت سے پاک ہو گئی جیسا ایک انگریزی شاعر نے کہا ہے "پتھر کی دیواریں قید خانے نہیں بنتے۔ نہ لوہے کی سلاخوں سے پنجرے بنتے ہیں ایک معصوم اور آزاد روح کی نظر میں مقام سندر ہے"

جس دن سقراط کو موت کا حکم سنایا گیا اسی دن معمولی سالانہ چڑھاوا لیکر جہاز شہر سے جزیرہ ڈیلوس کی طرف روانہ ہوا۔ قاعدہ تھا کہ اس جہاز کے ایام سفر میں کسی شخص کو موت کی سزا نہ دی جاتی تھی اس وجہ سے سقراط کو تیس دن جیل خانہ میں رہنا پڑا۔ ان ایام میں اس کے دوست اس کے پاس

آتے رہے اور وہ حسب معمول ہنسی خوشی مختلف مسئلوں پر ان سے بات چیت کرتا رہا۔ بعض شخصوں نے اُسے صلاح دی کہ وہ جیلخانہ سے نکل بھاگے وہ ہنس پڑا اور کہا "پہلے کوئی ایسی جگہ بتاؤ جہاں موت نہیں پہنچ سکتی"

اتنے دن اس طرح گزر گئے۔ سقراط کی موت کا دن آیا۔ اس وقت سقراط نے اپنے دوستوں کو مفصل اپدیش دیا کہ انسانی روح غیر فانی ہے۔ دشمن جسم کو کاٹ سکتے ہیں۔ روح کو نہ پانی گلا سکتا ہے نہ آگ جلا سکتی ہے اور نہ تلوار کاٹ سکتی ہے۔ ادھر موت اژدہا منہ کھولے ہوئے کھڑا تھا۔ اُدھر سقراط شانتی سے یہ اپدیش کر رہا تھا۔ شاید سارے پرانے لٹریچر میں ایک ہی اُپدیش اس اپدیش کا ثانی ہے اور وہ سری کرشن جی کی گیتا ہے۔ سقراط کے شاگردوں نے کہا "اُستاد ہمیں آخری نصیحت کرو ہم تمہارے بچوں کے لئے کیا دعا کریں اور خود کس طرح زندگی گزاریں"۔ سقراط نے کہا "جو کچھ میں ہمیشہ تم سے کہتا رہا ہوں اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتا۔ اگر تم احتیاط سے رہو تو تمہارے کام میرے اور میرے بچوں کی نظر میں مقبول ہوں گے۔ خواہ تم کوئی وعدہ نہ کرو لیکن اگر تم اپنی پرواہ نہ کرو اور نیکی کا خیال نہ رکھو تو باوجود وعدوں کے تمہارے کام پسندیدہ نہیں ہو سکتے"۔

کراٹیو نے کہا "اُستاد ہم تمہیں کس طریق سے زمین میں دفن کریں"۔ سقراط نے کہا "اگر تم مجھے پکڑ سکو اور میں بچ کر نکل نہ جاؤں تو جس طرح چاہو دفن کر لینا" دوسروں کی طرف سقراط نے دیکھا اور مسکرا کر کہا "دیکھو کراٹیو نے میری ساری باتیں ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے نکال دی ہیں۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ میری روح فانی نہیں میں پھر کہتا ہوں کہ میرا جسم ہی دفن ہو سکتا ہے جس طرح تم چاہو ملک کے قوانین اور رواج کے مطابق اس کو دفن کر دو لیکن میں تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد اس کی عورت اور تین بچے اس کے پاس آئے اور سقراط نے انہیں کچھ نصیحت دے کر رخصت کر دیا۔ شام ہونے لگی۔ سقراط باہر آکر بیٹھ گیا اور اس وقت سے بولنا بند کر دیا۔ اتنے میں جیل خانے کا ایک ملازم آیا اور کہا "سقراط جب کسی مجرم کو میں زہر کا پیالہ دیتا ہوں تو مجھے کوسنا شروع کر دیتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم معقول پسند ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں افسروں کا حکم مانتا ہوں۔ اگر تمہیں کوئی شکایت یا ناخوشی ہے تو ان سے ہونی چاہیئے مجھ سے نہیں۔ زہر پینے کی تیاری کرو"

یہ کہا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ سقراط نے اس سے کہا "بہت بہتر میں

تیار ہوں" ملازم وہاں سے چلا گیا سقراط کراٹیو کی طرف مخاطب ہو کر بولا "دیکھو! اس شخص کا دل کیسا نرم ہے۔ میرے ساتھ ہمیشہ یہ شریفانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ اب میری تکلیف کے خیال سے اسے رونا آرہا ہے۔ اچھا اگر زہر تیار ہے تو کسی سے کہو کہ لے آئے۔ اگر تیار نہیں تو تیار کراؤ۔"

کراٹیو۔ جلدی کیوں کرتے ہو؟ ابھی تو سورج غروب بھی نہیں ہوا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ دیر کر کے زہر پیتے ہیں۔ بعضوں کو حکم دیا جاتا ہے اور اس کے پیچھے بھی وہ دوستوں کے ساتھ مزے سے کھاتے پیتے ہیں۔

سقراط۔ بے شک۔ یہ درست ہے۔ جو لوگ دیر سے زہر پیتے ہیں وہ اس میں کچھ نفع دیکھتے ہیں لیکن مجھے دیر لگانے سے کیا فائدہ؟ ہاں ایک نتیجہ ضرور ہوگا۔ لوگ سمجھیں گے کہ مجھے زندہ رہنے کی حد سے زیادہ خواہش ہے اور اس خیال سے مجھ پر تمسخر کریں گے۔ جیسا میں کہتا ہوں ہونے دو۔

کراٹو کو زیادہ سوال و جواب کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے ایک ملازم کو باہر بھیجا اور اس کے ساتھ ایک اور شخص زہر کا پیالہ اٹھائے اندر آیا۔ سقراط نے اس شخص سے کہا "دوست! چونکہ تم ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتے ہو مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" اس نے جواب دیا "کچھ نہیں۔ فقط زہر پی کر آہستہ آہستہ چلتے پھرتے رہو۔ جب تمہاری ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں تو بیٹھ جاؤ۔" سقراط نے خوشی خوشی پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پرارتھنا کی کہ موت کے پیچھے دکھ نہ ہو۔ پرارتھنا کر کے اس نے زہر پی لیا۔ اس وقت حاضرین میں بہت سے رونے لگے سقراط نے کہا "دوستو اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ میں نے عورتوں کو یہاں سے بھیج دیا ہے تاکہ وہ اپنے آنسوؤں سے ہمیں بے چین نہ کریں میں نے سنا ہے کہ انسان کو شانت چت مرنا چاہیئے۔ شانتی کرو اور مرد بنو۔"

انھوں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ سقراط تھوڑی دیر چلتا پھرتا رہا جب ٹانگوں میں ہمت نہ رہی تو بیٹھ گیا۔ پھر کمزوری کی وجہ سے لیٹ گیا۔ پاؤں کو چٹکی دی گئی اور انھوں نے درد محسوس نہیں کیا۔ پھر ٹانگیں بے حس ہو گئیں۔ سقراط نے اپنے اوپر سے کپڑا اتارا اور

کہا "اسکولپس کے مندر میں مجھے ایک مرغ چڑھانا تھا وہ چڑھا دینا۔ دیکھو اس میں غفلت نہ ہو" کرائیٹو نے کہا "حکم کی تعمیل ہو گی۔ کوئی اور حکم؟" لیکن سقراط نے کوئی جواب نہ دیا تھوڑی دیر کے بعد اس نے ہاتھ پاؤں پھیلا دیئے۔ جیل کے ملازم نے کپڑا اٹھا کر دیکھا تو سقراط کی آنکھیں بے حس و حرکت تھیں۔ کرائیٹو نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

افلاطون کہتا ہے کہ یہ سب سے سیانے سب سے نیک اور سب سے منصف مزاج شخص کا انجام تھا۔

سیسرو لکھتا ہے کہ جب کبھی وہ اس حال کو پڑھتا تھا اس کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

ایپک ٹٹس

(از قلم لالہ دیوان چند جی ایم۔ اے)

دیکھو چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

مختصر حالات زندگی

ایپک ٹٹس فرجیا (اٹلی) میں پہلی صدی عیسوی کے درمیانی حصہ میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین ایسی گمنامی کی حالت میں تھے کہ کسی نے اس کا سنہ ولادت لکھنے کی بھی تکلیف گوارا نہ کی۔ اس کا بچپن کا نام بھی معلوم نہیں۔ ایپک ٹٹس کے معنی زر خرید کے ہیں اور یہ نام بعد میں اسے اس وجہ سے دیا گیا کہ وہ ایک زر خرید غلام[1] تھا۔ اس کی شکل نہایت بھدی تھی۔ وضع قطع سے بہت ادنٰے درجہ کا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی فروتنی

[1] اس وجہ سے ہم بھی آگے صفحات میں اس کے لئے زر خرید استعمال کریں گے۔

اس کے چہرہ پر بھی نمایاں تھی۔

اس زمانہ میں اٹلی میں غلامی کی رسم جاری تھی۔ غلاموں کے ساتھ مالک حیوانوں کی طرح سلوک کرتے تھے۔ دن رات غلام بیچارے کام کرتے تھے اور اس کے عوض میں ان کے ساتھ سختی اور بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ بوڑھا ہونے پر غلاموں کو باہر جزیروں میں چھوڑ آتے تھے تاکہ وہاں وہ بھوک سے مر جائیں۔ اگر آقا کا قتل ہو جاتا تو تمام غلاموں کو جو اس وقت زنجیروں میں یا کسی اور طرح سے بے بس ہوتے تھے مار ڈالا جاتا تھا۔ بعض اوقات مالک حیوانوں کی خوراک کے لئے اور مہمانوں کی تفریح کے لئے غلاموں کو مار دیتے تھے روما کی تہذیب یافتہ عورتیں غلاموں کے گوشت کو نوچتی تھیں اور پھر اس میں سوئیاں چبھوتی تھیں۔ کیونکہ اس اذیت کے نظارے سے انہیں راحت ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں زرخرید ایک شخص کے پاس بیچا گیا۔ اس شخص میں اپنی جماعت کی تمام برائیاں موجود تھیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ اُس نے زرخرید کی ٹانگ کو شکنجہ میں کھینچ کر شکنجہ گھمایا۔ بیچارے زرخرید کو جب تکلیف پہنچی تو اس نے کہا "آقا اگر ایسے ہی شکنجہ گھماتے جاؤگے تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی"۔ آقا نے شکنجہ اور گھمایا اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ زرخرید نے شکوہ و شکایت سے لب پاک رکھے اور فقط یہ کہا "مالک میں نے کہہ جو دیا تھا کہ اگر شکنجہ گھماتے جاؤگے تو ٹانگ ٹوٹ جائے گی"۔ بیچارے کی شکل پہلے ہی خراب تھی۔ غریبی میں رہنے سے جسمانی حالت بھی نہایت ناقص تھی۔ جو کسر رہ گئی تھی وہ اب آقا کی بے رحمی سے پوری ہو گئی۔

اس وقت بعض شخصوں کے پاس فاضل غلام بھی ہوتے تھے۔ ان کی گفتگو بھی خدمت خیال کی جاتی تھی۔ زرخرید چونکہ جسم سے ناکارہ تھا اس کے آقا نے اُسے ایک عالم کے پاس تعلیم کے لئے بھیج دیا۔ اس شخص کا نام روفس تھا۔ اس نے اسے دلی شوق سے پڑھایا اور اس کے دل و دماغ کو منور کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ ایک دن زرخرید منطق پڑھ رہا تھا۔ اُس نے غلطی کی۔ اُستاد نے ڈانٹا۔ اس نے کہا "اُستاد آخر غضب ہی کیا ہو گیا۔ میں نے قلعہ کو آگ تو نہیں لگا دی اتنا ناراض کیوں ہوتے ہو؟" اُستاد نے

کہا" احمق کیا قلعہ کو آگ لگانا ہی ایک غلطی ہے جس کے لئے انسان کو شرمندہ ہونا چاہیئے؟ تم دلیل کی درستی کا خیال نہیں کرتے۔ یہ بھی تو ویسے ہی قابل اعتراض ہے"

زرخرید ہر حال میں اپنی قسمت پر شاکر تھا اور مصیبتوں کو بھی برکتیں سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ ایسے بے رحم آقا کے پاس نہ بکتا اور آزاد رہتا تو ایسے فاضل استاد کے پاس تعلیم پانے کا اس کے لئے کوئی موقعہ نہ تھا۔

یہ معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح اسے آزادی ملی۔ اس کی رہائش کا مکان ادنیٰ درجہ کا جھونپڑا تھا۔ کبھی اس نے کنڈی نہیں لگائی اور نہ لگانے کی ضرورت پڑی۔ اس کے گھر کا سارا اسباب دو چیزیں تھیں۔ ایک پڑ رہنے کی چٹائی اور ایک مٹی کا چراغ ایک دفعہ اس نے ایک لوہے کا دیا خریدا۔ ایک چور آیا اور اسے چرا لے گیا۔ اس نے ہنس کر کہا" اگر چور پھر آئے گا تو اسے ضرور مایوس جانا پڑے گا۔ کیونکہ اب کے لوہے کا چراغ بھی نہیں ہوگا"

جب شہنشاہ ڈومیشن تخت پر بیٹھا تو اس نے حکم دیا کہ تمام فلاسفر اٹلی سے نکال دیئے جائیں۔ زرخرید کو بھی اس قانون کے مطابق ملک چھوڑنا پڑا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس جلا وطنی کو طبعی شانتی سے قبول کیا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ جب ایگرپنس نہا کر آیا تو اس سے کہا گیا کہ اس پر فتوےٰ دیا گیا ہے۔ اس نے پوچھا" موت کا یا جلا وطنی کا؟" جواب ملا" جلا وطنی کا" پوچھا" کیا مال و اسباب ضبط کیا گیا ہے؟" جواب ملا" نہیں" بولا" اچھا چلو اسباب باندھیں ملک کی سرحد پر چل کر کھانا کھائیں گے" زرخرید پر بھی جلا وطنی کا اثر اس سے برا نہیں ہوا۔

اس کی وفات کا سال معلوم نہیں۔

نیچے اس کی تعلیم سے چند اقتباس دیئے جاتے ہیں۔ یہ کہہ دینا شاید ضروری ہے کہ باوجود اپنی خوب صورتی اور مٹھاس کے اس کی زندگی اور تعلیم ایک ضروری پہلو میں بالکل نامکمل ہیں۔ اس نے کبھی کوشش نہیں کی کہ اپنی حالت کو بہتر کرے بلکہ جو مصیبتیں اس کے سر پر آئیں ان کی ہستی سے ہی انکار کیا اور اس طرح اپنے آپ کو

تسلّی دی۔ اپنی روح کو سکیڑ کر اس نے ان تمام سُکھوں کو جو خود بخود اُسے نہ مل گئے۔ سُکھ تصور کرنا چھوڑ دیا۔ جب کسی نے اس سے زیادتی کی۔ اس نے سر جھکا لیا اور اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ وہ زیادتی پاپ کی فتح ہے اور اس کا مقابلہ ضروری ہے وہ تقدیر کے مسئلہ کا قائل تھا اور مانتا تھا کہ ہم اپنے بیرونی حالات کو تبدیل نہیں کر سکتے اگر تمام نیک آدمی اس خیال کے ہو جائیں تو شریر النفس لوگ ایک دن میں سب کا دم ناک میں کر دیں۔ مکمل زندگی وہ ہے جو ہمیشہ ایک اعلیٰ معراج کو پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور اس معراج کے راستے میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کو دور کرتی ہے اگر مکاری اور شراب کا زور ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس زور کو توڑیں۔ اپنی حالت پر شاکر رہنا موت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ کوشش کریں اور جو نتیجے کوشش کے بعد پیدا ہوں ان کو سر آنکھوں پر قبول کرنا سچی قناعت ہے۔

زرخرید بار بار ظاہر کرتا ہے کہ موت سے اُسے ڈر نہیں کیونکہ وہ غیر فانی نہیں جو بنا ہے اُسے ٹوٹنا ضروری ہے۔ اس جواب سے زیادہ زبردست جواب وہ ہے جو سقراط نے یا حقیقت رائے نے دیا۔ دونوں موت سے نڈر تھے کیونکہ وہ یقین کرتے تھے کہ وہ غیر فانی ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ ناظرین ذیل کے اقتباس پڑھتے ہوئے خیال رکھیں کہ کن پہلوؤں میں زرخرید کی تعلیم کو مکمل کرنا ضروری ہے۔ ایسی تکمیل کے بغیر یہ تعلیم ہماری تباہی کا موجب ہو سکتی ہے اور ایک خاص حد تک ایسے خیالات ہی ہمارے تنزل کا موجب ہوئے ہیں۔

زرخرید کی تعلیم

انسان میں اتنی طاقت گویائی کہاں جو پرماتما کے احسانوں کا شمار کر سکے؟ کیا ہمارا فرض نہیں کہ زمین کھودتے۔ ہل چلاتے اور کھانا کھاتے وقت ہم پرماتما کی بڑائی کا اقرار کریں جس نے ہمیں زمین کاشت کرنے کے لئے ہتھیار اور کھانے کے لئے ہاتھ دیئے ہیں اور کھانا ہضم کرنے کی قابلیت دی ہے؟ اس کی مہربانی سے ہم بڑھتے ہیں اور نیند لے کر آرام کرتے ہیں۔ ان نعمتوں کے لئے ہمیں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے اور سب سے بڑھ کر

اس عنایت کے لئے کہ ہمیں ان نعمتوں کی قدر سمجھنے اور ہمیشہ ان کا استعمال کرنے کی قابلیت عطا ہوئی ہے۔ چونکہ تم میں اکثر اندھے ہیں۔ کیا ضروری نہیں کہ کوئی شخص تمہاری جگہ یہ فرض ادا کرے اور سب کی طرف سے پرماتما کا شکریہ ادا کرے؟

میں بوڑھا ہوں اور لنگڑا ہوں۔ اس کے سوا مجھ سے کیا ہو سکتا ہے۔ اگر میں بلبل ہوتا تو بلبل کے راگ گاتا۔ اگر ہنس ہوتا تو ہنس کی راگنی الاپتا لیکن میں ذی عقل جاندار ہوں اس لئے میرا فرض ہے کہ پرماتما کی تعریف گاؤں۔ یہ میرا کام ہے اور میں اسے کرتا ہوں۔ تم سے بھی میں کہتا ہوں کہ اسی راگ کو گاؤ جتنی دفعہ سانس لیتے ہو۔ اس سے بھی زیادہ دفعہ پرماتما کا دھیان کرو۔ کھانے میں ناغہ ہو جائے لیکن پرماتما کی یاد میں ناغہ نہ ہو۔

دولت و خوشی دل سے سوال کرو کہ تمہاری خواہش دولت حاصل کرنے کی ہے یا خوشی حاصل کرنے کی؟

اگر تم دولت مند بننا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ نہ تو دولت ایک برکت ہے اور نہ ہی اس کا حاصل کرنا بالکل تمہارے اختیار میں ہے اگر تم خوشی حاصل کرنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ یہ برکت ہے اور اس کا حاصل کرنا تمہارے اختیار میں بھی ہے۔ دولت قسمت کا عارضی قرض ہے جو تمہیں ملتا ہے لیکن خوشی کا انحصار بالکل تمہاری مرضی پر ہے۔ جب تم سانپ۔ بچھو یا بھڑ کو ہاتھی دانت یا سونے کے برتن میں بیٹھا دیکھتے ہو تو ہاتھی دانت یا سونے کی وجہ سے ان جانوروں پر شیدا نہیں ہو جاتے بلکہ انہیں موذی سمجھ کر ان سے نفرت کرتے ہو۔ جب بدی کو شان و شوکت اور دبدبہ سے گھرا ہوا دیکھو تو ان چیزوں کے چمتکار سے گھبرا نہ جاؤ۔ بدی کے کمینہ پن کی طرف خیال کرو اور اس سے نفرت کرو۔

قناعت میری کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ لوگ مجھ سے نفرت کریں گے ایسے خیالات سے دل کو دکھ مت دو۔ تمہارا باحیثیت ہونا ان حالات میں ہی تمہارا فرض ہے جو تمہارے اختیارات میں ہیں۔ ناٹک کے مصنف نے

تمہیں ایک پارٹ دیا ہے۔ تمہارا کام اس پارٹ کا کرنا ہے اگر اس کی خواہش ہے کہ تم ایک گداگر کا پارٹ کرو تو تمہیں یہ خوش اسلوبی اور خلوص دل سے کرنا چاہیئے اگر تمہارا پارٹ لنگڑے گمنام یا حاکم کا ہے تو بھی ویسے ہی خوش اسلوبی سے کرو۔ جو کام تمہیں سونپا گیا ہے اُسے اچھی طرح کرنا یہ تمہارے اختیار میں ہے۔ تمہارے لئے کام کا چننا دوسرے کا کام ہے۔ غلام نائب السلطنت کی طرح آزاد ہو سکتا ہے اور آزادی ہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ باقی سب نعمتیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ اگر آزادی ہو تو باقی نعمتیں غیر ضروری ہو جاتی ہیں۔ اگر آزادی نہ ہو تو باقی کچھ بھی نعمت کہلانے کے قابل نہیں۔ کوئی شخص تمہاری ہتک نہیں کر سکتا اگر تم اس کے الفاظ یا افعال کو اپنے لئے ہتک آمیز نہ سمجھو۔ اگر تم اپنے حالات کو اپنی خواہشوں کے مطابق نہیں بنا سکتے تو اپنی خواہشوں کو حالات کے مطابق بنا لو۔ جب زندگی کے بہترین انعام تم سے جاتے رہیں تو مت خیال کرو کہ وہ تم سے چھینے گئے ہیں۔ یہ سمجھو کہ جس پرماتما نے وہ تمہیں دیئے تھے اُسے تم نے واپس دے دیئے ہیں۔ تمام مشکلات کے مقابلہ کے لئے تمہارے دل میں خود ایک علاج ہے۔ نفسانی خواہشات کے غلام مت بنو کوئی تکلیف پہنچے تو صبر سے برداشت کرو جب اوروں پہ دکھ اور مصیبتیں نازل ہوں تو اُن سے ہمدردی کرو لیکن اپنے دل میں یاد رکھو کہ جوان مردوں داناؤں اور سچے آدمیوں کے لئے مصیبت ایک موہوم چیز ہے۔ اس کی اصلیت کچھ نہیں ایسے آدمی کوؤں کے چلانے سے خوف زدہ نہیں ہوتے وہ ان کے اثر سے محفوظ ہو چکے ہیں۔

اذیت اور موت کا ڈر

سخت مصیبت میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم فقط یہ سوچ سکتے ہیں کہ کیا ہمارے اختیار میں ہے اور کیا ہمارے اختیار سے باہر ہے؟ مجھے مرنا ضرور ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ میں آہ و فغاں کرتا ہوا مروں؟ مانا مجھے زنجیروں میں باندھا جانا ہے لیکن کیا ضروری ہے کہ میں روتا ہوا باندھا جاؤں؟ مانا کہ مجھے جلاوطن ہونا ہے

لیکن مجھے ہنسی خوشی اپنے مقسوم کو قبول کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ اگر مجھ سے کہا جائے کہ راز کا افشا کروں تو میں کہوں گا نہیں۔ یہ میرے اختیار میں ہے اگر کہا جائے کہ بھید نہ بتانے کے لئے میرے زنجیریں ڈالی جائیں گی تو میں کہوں گا صاحب کیا کہتے ہو؟ سوچ سمجھ کر بات کرو۔ میری ٹانگوں میں تم زنجیر ڈال سکتے ہو لیکن مجھے نہیں باندھ سکتے۔ اگر مجھے قید کی دھمکی دی جائے تو میں کہوں گا۔ میں نے تو کبھی اپنے آپ کو غیر فانی نہیں کہا۔ میں زندہ رہنے والا نہیں بلکہ ایک انسان ہوں۔ میں ایک ٹکڑا ہوں جس طرح گھنٹہ دن کا ٹکڑا ہوتا ہے گھنٹہ کی طرح میرا آنا ہوا ہے اور اسی طرح مجھے گزر جانا ہے۔ اس میں کیا فرق پڑ جاتا ہے کہ میں کس طرح گزر جاتا ہوں۔ ڈوب کر یا بخار سے؟ ایک طرح نہ گزرا تو دوسری طرح گزرنا پڑے گا۔

سورج کی طرح خود بخود چمکو

سورج اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ لوگ اس کے طلوع ہونے کے لئے پرارتھنا کریں اور تب وہ ظاہر ہو بلکہ وہ خود چمکتا ہے اور سب لوگ اسے دیکھ کر اُسے پیار کرتے ہیں۔ ایسے ہی تم اس بات کا انتظار نہ کرو کہ لوگ تمہاری تعریف کریں۔ تمہیں تحسین و آفرین کہیں اور پھر تم نیکی کے کام کرو۔ خود بخود نیک کام کرو اور لوگ تمہیں سورج کی طرح پیار کریں گے۔

زندگی میں فتح اور شکست

اپنی نظروں میں اور پرماتما کی نظروں میں پوترر ہنے کی کوشش کرو۔ اگر کوئی برا خیال تمہارے دل میں آئے تو پرماتما سے مدد کے لئے پرارتھنا کرو یا اُٹھو اور نیک لوگوں کی مجلس میں جاؤ اور ان کی مثال کی پیروی کرو خواہ ایسے شخص زندہ ہوں یا مر چکے ہوں۔ سقراط کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ کس طرح اس نے تمام ترغیبوں اور نفسانی خواہشوں پر فتح حاصل کی ہے۔ اصلی فتح ہے تو یہ ہے جس کے مقابلہ میں میدان کارزار کی فتوحات بے حقیقت ہیں۔ اگر تم ایسی عادت ڈالنے کی کوشش کرو تو جلدی ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری طاقت کتنی بڑی ہے۔ یہ مقابلہ

محنت ہے۔ یہ کام نہایت مبارک ہے اور اس کا انجام راجیہ۔ آزادی۔ شانتی۔ دلی اطمینان اور راحت ہیں۔ پرماتما کا دھیان کرو اور اس سے مدد مانگو۔ جس طرح ملاح طوفان میں اس سے مدد مانگتے ہیں۔ سب سے زیادہ تند طوفان وہ ہے جس میں بری خواہشیں عقل کو سیدھے راستہ سے پرے پھینک دیتی ہیں۔ سمندری طوفان اس کے سامنے ہیچ ہے۔ موت کا ڈر دل سے نکال دو اور طوفان خواہ کتنا ہی تند ہو تم دیکھو گے کہ آتما کی شانتی کتنی زبردست ہے لیکن اگر تم گر پڑو اور دل کو تسلی دو کر پھر فتح کر لو گے۔ ایسے موقعہ بار بار تمہاری زندگی میں آئیں تو یقین جانو کہ انجام کار تمہیں برائیاں برائیاں معلوم ہی نہیں ہوں گی بلکہ تم ان کے لئے عذر ڈھونڈنے کی کوشش کرو گے۔ اگر ایک دفعہ ناکامیاب رہو تو ہمت نہ ہار بیٹھو۔ اکھاڑے میں جب ایک لڑکا گر پڑتا ہے تو استاد اس سے کہتا ہے "اٹھو اور پھر کشتی لڑو۔ لگاتار سے ایسا کرنے کی ہدایت ہوتی ہے اور آخر وہ طاقت حاصل کر لیتا ہے ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ ایسے کمزور اور پست ہمت مت بنو کہ ایک ہی دفعہ گر کر پھر اٹھنے کے ناقابل ہو جاؤ۔ مضبوط ارادہ کرو اور فتح تمہاری ہے۔ کوشش چھوڑ دو اور ابتری اور تباہی کے سامان موجود ہیں۔

سچی خوشی کہاں ہے؟

لوگوں کو بتاؤ کہ جہاں وہ غلطی اور دکھ کے سبب سے راحت کو سمجھے بیٹھے ہیں وہاں راحت نہیں۔ سچی خوشی جسمانی طاقت اور دولت میں نہیں کیونکہ بہت سے دولتمند اور مضبوط آدمی ناخوش ہیں۔ خوشی اقتدار اور حکومت میں نہیں کیونکہ بہت با اختیار حاکم ناخوش ہیں۔ خوشی جسمانی طاقت۔ دولت اور حکومت تینوں کے مجموعہ میں بھی نہیں کیونکہ ان تینوں چیزوں کو رکھتے ہوئے بھی بعض لوگ روتے اور چلاتے رہے ہیں خوشی تمہارے اندر ہے۔ خوشی کے لئے ضروری ہے کہ تمہیں سچی آزادی حاصل ہو تمہیں کوئی خطرہ نہ ہو نفسانی خواہشات تمہارے بس میں ہوں۔ قناعت اور شانتی تمہارے دل میں ہوں۔ غریبی میں۔ جلاوطنی میں۔ بیماری میں اور موت کے منہ میں

بھی تمہاری طبیعت پریشان نہ ہو۔ کیا تم یہ مقابلہ کر سکتے ہو؟ کیا تم میں یہ طاقت ہے؟ یہ طاقت تمہیں پرماتما کی مدد اور مہربانی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

غریب کون ہے؟

ایک دفعہ ایک شخص زر خرید کے پاس آیا اور باتوں باتوں میں اس کی غریبی کی طرف اشارہ کیا۔ زر خرید نے کہا "تم مجھ سے زیادہ غریب ہو۔ میری حالت ہمیشہ ایک جیسی ہے۔ میں مزے میں ہوں کوئی میرا مربی ہو یا نہ ہو مجھے اس کی کیا پرواہ ہے؟ تم اس کی پرواہ کرتے رہو اس لئے میں تم سے زیادہ دولت مند ہوں مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ قیصر میرے متعلق کیا خیال کرتا ہے۔ میں کسی کی خوشامد نہیں کرتا۔ تمہارے پاس سونے چاندی کے برتن ہیں۔ میرے پاس ان کی جگہ یہ چیزیں ہیں تمہارے برتن تو سونے چاندی کے ہیں لیکن تمہاری دلیلیں۔ خواہشات اور اصول مٹی کے ہیں۔ میرا دل ہی میرے لئے ایک مملکت ہے۔ میں اپنے خیالات میں مگن رہتا ہوں۔ تم بیکار رہتے ہو اور اس سے تمہیں دکھ ہوتا ہے۔ تمہیں ہوس باقی ہے میری ترشنا مٹ چکی ہے۔ مبارک وہ ہے جو کچھ اُمید نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ مایوس نہیں ہو سکتا"

اپنی بابت

تم پوچھتے ہو۔ کس طرح ایک شخص جس کا مکان نہیں۔ جس کے پاس کھانے کا سامان اور پہننے کے کپڑے نہیں جو محض نادار ہے شانتی سے گزارا کر سکتا ہے۔ دیکھو پرماتما نے تمہارے پاس ایک ایسا شخص بھیجا ہے جو تمہیں اپنے ہر ایک فعل سے دکھا سکتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ میری طرف دیکھو۔ میرے پاس نہ مکان ہے۔ نہ مال و اسباب ہے اور نہ نوکر ہیں۔ میں زمین پر سوتا ہوں۔ میری بیوی اور بال بچے نہیں۔ میری تمام جائداد زمین آسمان اور ایک چغہ ہیں لیکن مجھے کس چیز کی کمی ہے؟ کیا میں غم اور خوف سے آزاد نہیں؟ تم نے کب مجھے کسی مدعا کے حصول میں ناکامیاب دیکھا؟ تم نے کب مجھے ایسا کام کرتے دیکھا جو میں ناپسند کرتا ہوں؟ کب میں نے کسی پر الزام لگایا ہے؟ کیا تم نے کبھی

میرے چہرے پر ملال دیکھا؟ جن شخصوں کی تم تعریف کرتے ہو یا جن سے تم ڈرتے ہو میں ان سے کیسا سلوک کرتا ہوں؟ کیا ایسا نیلیا غلاموں سے کیا جاتا ہے؟ کون شخص مجھے دیکھتا ہے اور یہ خیال نہیں کرتا کہ وہ اپنے مالک اور بادشاہ کو دیکھ رہا ہے؟

متفرق اپنے لئے اعلیٰ معراج قائم کرو اور پھر اس معراج تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہو۔ اپنے سامنے بڑے اور نیک آدمیوں کے نمونے رکھو۔ ظاہری نمائش پر لٹو نہ ہو جاؤ نیکی پر عمل کرو۔ اس بات کی پروا مت کرو کہ لوگ کیا کہتے ہیں یا خیال کرتے ہیں جس طرح پاؤں کے لئے جوتا ضروری ہے نہ کہ سنہری اور جڑاؤ کام ویسے ہی جسمانی ضروریات گنتی کی ہیں۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ جائز تعلقات قائم رکھو اگر وہ زیادتی کرتے ہیں تو تمہارے فرائض تو قائم رہتے ہیں۔ اگر تمہارا بھائی انصاف کی پروا نہیں کرتا تو بھی تمہارا بھائی ہے۔ اگر تمہارا باپ زیادتی کرتا ہے تو بھی تمہارا باپ ہے۔ تم اپنے رشتہ کا خیال رکھو۔ نہ اس بات کا کہ وہ مستحق ہیں یا نہیں؟

گورو گوبند سنگھ جی مہاراج

از قلم لالہ دیوان چند جی ایم۔ اے

دشمن کے آگے سر نہ جھکے گا کسی طرح
یہ آسماں زمیں سے ملایا نہ جائے گا

ابتدائی حالات سمت ۱۷۲۳ بکرم میں جبکہ گورو تیغ بہادر آسام کی طرف گئے ہوئے تھے گوبند پٹنہ میں پیدا ہوا۔ بچپن میں ہی اس میں بعض اوصاف پائے جاتے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر اس کی مناسب

نشو ونما ہوئی تو وہ ایک دلاور اور جنگجو سپاہی بنے گا۔ اپنے ہم عمر لڑکوں کو وہ دو صفوں میں تقسیم کر لیتا اور خود کپتان بن جاتا۔ ان میں جو جھگڑے ہوتے ان کا بھی فیصلہ کر دیتا۔
گوبند ابھی بچہ ہی تھا جب کشمیر سے کچھ ستم رسیدہ برہمن گورو تیغ بہادر کے پاس آئے اور آکر اس ظلم و تعدی کا ذکر کیا جو مسلمان حاکم اپنی ہندو رعایا پر روا رکھتے تھے۔ ہندوؤں کے جان و مال محفوظ نہیں تھے۔ ان کے دھرم پر ہر وقت چوٹیں ہوتی تھیں۔ ہر طرح سے ان کی بے حرمتی کی جاتی تھی گورو تیغ بہادر نے یہ حالات سُنے اور بہت سوچ میں پڑ گئے۔ اس وقت ان کی طاقت اتنی کمزور تھی کہ مغلیہ حکومت کے مقابلہ کا خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ وہ اسی سوچ کی حالت میں تھے جب گوبند ان کے سامنے آ گیا۔
گوبند نے کہا "واجب التعظیم پتا! آپ آج غمزدہ کیوں ہیں؟ آپ کی تکلیف دیکھ کر میں بے چین ہو رہا ہوں آپ مجھے بتائیں کیا بات ہے؟" گورو تیغ بہادر نے سب حال بیان کیا اور کہا "بیٹا! شہیدوں کا خون قومی بنیادوں میں گچ (گارے) کا کام دیتا ہے۔ جب ظلم و ستم حد سے بڑھ جاتے ہیں اور لوگوں پر زندگی وبال ہو جاتی ہے۔ اس وقت قربانی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ہماری قوم کی موجودہ حالت سنورنے کے لئے ضروری ہے کہ کوئی مہاپرش اپنے آسکو قربان کر دے" گوبند نے کہا "بے شک اتنی بڑی مصیبت کا علاج بھی اس سے کم نہیں ہو سکتا لیکن آپ تذبذب کی حالت میں کیوں ہیں؟ میں تو خیر آپ کا فرزند ہوں۔ دوسرے لوگ بھی آپ کو اس وقت کا مہاپرش سمجھتے ہیں۔ اگر قربانی کی ضرورت ہے اور آپ کو اس علاج پر یقین ہے تو آپ آگے بڑھیں اور خود قربان ہوں" گورو تیغ بہادر نے ان الفاظ کو سُنا اور خوش ہوئے اور انہوں نے کہا "اگر میں اپنا کام کرتے ہوئے مر جاؤں تو بھی یہ کام بند نہیں ہو سکتا گوبند میرا لڑکا اس کے لئے موجود ہے۔"
اس وقت سے گورو تیغ بہادر اور سلطنت مغلیہ کے تعلقات بگڑنے شروع ہو گئے انہیں بادشاہ نے دہلی طلب کیا اور انہوں نے سمجھا کہ غالباً مرنے کے لئے جاتے ہیں۔ گوبند کو بلایا اور کہا "بیٹا میں غالباً مرنے کے لئے جاتا ہوں تم سکھوں کے دسویں گورو بنو گے

دیکھو! میری نعش وہاں خراب ہونے کے لئے نہ پڑی رہے۔ میری موت کا بدلہ لینا تمہارا کام ہوگا۔ گوبند کی عمر اس وقت ۱۵ سال کی تھی۔ گورو تیغ بہادر کو اورنگ زیب نے ہزاروں برہمنوں کی طرح جیل خانہ میں ڈال دیا اور کہا "اگر آزادی چاہتے ہو تو اسلام قبول کرو۔ اگر مسلمان نہیں بنتے تو کوئی معجزہ دکھاؤ" گورو تیغ بہادر جب بہت دق ہوئے تو انہوں نے کہا "اچھا میں معجزہ دکھاتا ہوں۔ میں یہ کاغذ گلے میں باندھتا ہوں اب تلوار میرا جسم نہیں کاٹ سکتی" بادشاہ نے حکم دیا کہ جلاد تیغ بہادر کی گردن پر تلوار چلائے۔ تلوار کے پہلے وار سے ہی سر تن سے جدا ہو کر نیچے جا پڑا۔ کاغذ پڑھا تو اس میں لکھا تھا "سر دیا۔ سر نہ دیا" وہ سر گوبند کے پاس پہنچا۔ گوبند نے آخری رسم ادا کی اور اپنے شاگردوں کو جمع کر کے کہا "تم نے دیکھا! ظلم و ستم کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ہمارے بزرگ گورو کو اس بے رحمی سے قتل کیا گیا ہے۔ ہماری قومی بے حرمتی میں کوئی کسر باقی نہیں رہی۔ ہم لوگوں نے انکسار اور حلم کو ہی انسانی کیرکٹر کا زیور سمجھ لیا ہے لیکن جب مخالف ہمیں پاؤں میں کچلنے کی کوشش کریں تو ہمیں اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ گوبند نے برہمنوں کے مشورہ سے نینا دیوی کے پہاڑ پر ایک بڑا ہون کیا اور عام روایت کے مطابق دیوی اس پر ظاہر ہوئی۔ اس وقت وہ کچھ سہم گیا۔ دیوی ایک تلوار ہون کنڈ میں چھوڑ گئی۔ برہمنوں نے کہا یہ نیک فال ہے لیکن تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے کیونکہ تم سہم گئے تھے۔ اب اپنے آپ کو اگنی کنڈ میں ڈال دو تب ہون مکمل ہوگا۔ گوبند نے کہا "میں نے یہ ہون اپنی مدد کے لئے کیا ہے نہ کہ اپنی موت کے لئے۔ اگر میں ہی نہ رہا تو کام کون کرے گا؟" اس سے ایک لڑکا قربان کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس کی ماں یہ سن کر بہت خفا ہوئی اور کہا "تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ بچوں کو جلا کر تم فتح حاصل کرنا چاہتے ہو میں اس وحشی پن کی اجازت نہیں دیتی" گوبند سے کہا گیا کہ کسی شاگرد کا سر ہی کافی ہے گوبند نے شاگردوں سے اپیل کی۔ آخر بعض شخص آگے بڑھے اور ان میں سے ایک کا سر قلم کر کے ہون کو مکمل کیا گیا۔

اس ہون سے فارغ ہو کر گوبند نے چاہا کہ وہ اپنے شاگردوں کا ایک جتھا بنائے تاکہ ان میں اور دوسرے لوگوں میں تمیز ہو سکے اور وہ اس سے زیادہ گہرے تعلقات سے وابستہ ہو جائیں۔ اس نے ایک مجمع عام کیا اور کئی خیمے کھڑے کر دیئے۔ سپاہیانہ لباس پہن کر تلوار ہاتھ میں لے لی اور شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہا "میرے عزیزو! مجھے ایک ایسے عزیز شاگرد کی ضرورت ہے جو اپنا سر دینے کے لئے تیار ہو کیونکہ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے میں اسے ضروری سمجھتا ہوں"۔ ایک شاگرد آگے بڑھا۔ گوبند اُسے پکڑ کر پاس کے ایک خیمہ میں لے گیا۔ اُسے وہاں بٹھا دیا اور ایک بکرے کو جو وہاں پہلے سے موجود تھا ذبح کر دیا۔ خون آلودہ تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے باہر آیا اور پھر کہا "میرے عزیزو! مجھے ایک ایسے شاگرد کی ضرورت ہے جو اپنا سر دینے کے لئے تیار ہو کیونکہ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے میں اُسے ضروری سمجھتا ہوں" ایک سکھ آگے بڑھا۔ گوبند اُسے دوسرے خیمہ میں لے گیا اور اُسے وہاں بٹھا کر ایک دوسرے بکرے کو ذبح کیا۔ یہی عمل تین دفعہ اور کیا۔ تب وہ پانچوں سکھوں کو باہر لایا اور کہا "اب جبکہ پانچ آدمی میری مشن کی تکمیل کے لئے مرنے کے واسطے تیار ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں زندگی موجود ہے اور وقت آگیا ہے کہ باقاعدہ خالصہ بنائے جائیں۔ تب اس نے ان پانچوں کو پاہل دی اور پھر ان سے پاہل لی۔ اس وقت اس نے کہا "آج سے تم سکھ (شاگرد) نہیں بلکہ سنگھ (شیر) بنتے ہو۔ آج سے میرا نام گوبند سنگھ ہے تم دوسرے لوگوں کو پاہل دے سکتے ہو۔ پانچ سنگھوں کا موجود ہونا دوسرے لوگوں کو خالصہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ تم اپنے سر پر کیس رکھو، سر میں کنگھا اور ایک کرد رکھو۔ تمہارے ہاتھ میں ایک کڑا رہے اور کچھ تمہارے لباس کا ایک حصہ ہو۔ تم ذات پات اور چھوت چھات کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ چھوٹے بڑے کا خیال دل سے دور کر دو۔ ظاہری رسوم کی پروا نہ کرو۔ مردم پرستی اور قبر پرستی توہمات ہیں۔ ایک ایشور کی پوجا کرو" کیونکہ گورو گوبند سنگھ نے چھوٹی ذاتوں کو اعلیٰ درجہ دیا اس لئے بہت سی چھوٹی ذاتوں کے آدمی ان کے شاگرد بن گئے۔ گورو گوبند سنگھ نے اپنی باقاعدہ فوج تیار کی۔ جب ان کی جمعیت

بڑھ گئی تو پہاڑی راجوں اور اورنگ زیب سے ان کے تنازعے شروع ہو گئے۔ اورنگ زیب نے لاہور کے حاکم زبردست خاں کو ان کی سرکوبی کے لئے ہدایت کی اور دو لڑکے زور آور سنگھ اور فتح سنگھ وہاں سے جان بچاکر نکل گئے۔

زور آور سنگھ اور فتح سنگھ کی شہادت

سرہند میں وہ ایک پرانے برہمن ملازم کے گھر میں جا ٹھہرے اُس نے رات کو ان کے زیور اٹھا لئے اور جب گوجری نے اس سے دریافت کیا تو کہا "تم نے نیکی کا اجر خوب دیا ہے۔ دیکھو! میں ابھی حاکموں کو اطلاع دیتا ہوں اور تم پکڑے جاؤ گے" اس نے مسلمانوں کو اطلاع دی۔ دونوں بچے وزیر حاکم سرہند کے پاس بھیجے گئے۔ اس وقت ان کی بارہ اور آٹھ سال کی عمر تھی۔ حاکم نے ان سے کہا۔ "مذہب اسلام قبول کر لو اور زندگی مزے سے گزارو" بڑے بھائی نے جواب دیا "ہم اس دھرم پر یقین رکھتے ہیں جو گورو نانک نے عام لوگوں کی ہدایت کے لئے پرچار کیا ہے۔ ہم گورو تیغ بہادر کی اولاد ہیں جنہوں نے ہنسی خوشی اپنا سر کٹوا دیا تاکہ سچائی کی فتح ہو اور ہندو قوم کی رکھشا اور پاپ کا زور توڑنے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ ہماری رگوں میں ان کا خون بہتا ہے۔ ہم تمہارے مذہب کو کیسے قبول کر سکتے ہیں؟ ہمارا مسلمان ہو جانا پرماتما کی نافرمانی کرنا ہے۔ ہمیں خاندان کی ننگ و ناموس اور قومی حرمت کا خیال ہے۔ ہم اپنے دھرم کو چھوڑ نہیں سکتے۔ مسلمان بن کر ہمیں دولت و منزلت مل سکتی ہے لیکن موت سے تو کسی حال میں چھٹکارا نہیں۔ ہم ان معمولی فائدوں کے لئے اپنے آبائی دھرم کو چھوڑنا نہیں چاہتے" حاکم اس جواب کو سُن کر ناراض ہوا اور حکم دیا کہ انہیں قتل کیا جائے۔ پاس سے ایک مسلمان نواب نے کہا "ہمارے مذہب کے مطابق ان کا قتل روا نہیں۔ ہماری عداوت ان بچوں کے باپ سے ہے ان سے نہیں" پاس سے ایک ہندو مشیر دیوان سچانند نے کہا "سانپ کے بچے بھی آخر سانپ ہی بنیں گے۔ آج انہیں بچا لو پھر ان کے ساتھ مقابلے کرنے پڑیں گے" حاکم نے کہا "انہیں زندہ دیوار میں چنوا دیا جائے۔" جب جسم کا کچھ حصہ دیوار میں چُنا گیا تو حاکم

نے پھر کہا "اب بھی اسلام قبول کر لو۔ نادان لڑکو! کیوں دنیا سے بے مراد مرتے ہو؟"
انہوں نے پھر نفرت کے ساتھ اس تجویز کو نامنظور کیا۔ جب دیوار قریباً منہ تک چُنی
گئی تو زور آور سنگھ نے کہا "فتح سنگھ کہو! "واہ گورو جی کی فتح۔ ہمت نہ ہارنا۔
یاد رکھو کس کا خون تمہاری رگوں میں بہتا ہے جو جرأت اور حوصلہ ماں کے دودھ میں
تمہیں ملا ہے۔ اس کا ظہور آج ہوگا" فتح سنگھ کا چہرہ کھل گیا اور کہا "واہ گورو جی کی فتح"
یہ ان کے آخری الفاظ تھے۔ گوجری نے جب پوتوں کی موت کا حال سنا تو وہ
اسی غم میں مر گئی۔

اجیت سنگھ اور جھجھار سنگھ کی شہادت

جب کھووال میں ساماں رسد ختم ہو گیا

تو گورو گوبند سنگھ چالیس ہمراہیوں کے ساتھ قلعہ چکور میں جا پہنچے۔ یہ قلعہ روپڑ کے نیچے
ہے۔ شاہی فوج نے ان کا پیچھا کیا اور اس قلعہ کو گھیر لیا۔ خواجہ محمد اور ناہر خاں شاہی
فوج کے افسر تھے۔ انہوں نے ایک ایلچی کی معرفت کہلا بھیجا کہ گورو گوبند سنگھ کا مقابلہ
معمولی پہاڑی راجوں سے نہیں بلکہ سلطنت مغلیہ سے ہے ان کے لئے اس مقابلہ میں کامیاب
ہونا ناممکن ہے اس لئے انہیں بادشاہ کی اطاعت اور مذہب اسلام قبول کر لینا چاہئیے۔
گورو گوبند سنگھ کے لڑکے اجیت سنگھ نے جواب میں کہا "تم کون ہو جو ہمیں اطاعت
قبول کرنے اور مسلمان ہونے کی صلاح دیتے ہو؟ ہم موت کو ایسے حالات پر ترجیح
دیتے ہیں۔ مردوں کی طرح لڑیں گے اور جو نتیجہ ہوگا اس کو سر آنکھوں پر قبول کریں گے"
غرض جنگ ہونی شروع ہوئی۔ قریباً سارے ہمراہی کام آئے۔ اجیت سنگھ نے باپ
سے اجازت لی اور میدان جنگ میں مر گیا۔ کئی آدمیوں کو کاٹ ڈالا پھر خود بھی کٹ
گیا۔ جھجھار سنگھ اس کا چھوٹا بھائی باپ سے کہنے لگا "اجیت نے دھرم کے لئے جان
دے کر زندگی حاصل کی ہے۔ مجھے بھی اجازت ملے کہ میں بھی اپنی زندگی کا استعمال
کروں" گورو گوبند سنگھ نے اجازت دی۔ جب جھجھار سنگھ تیار ہو کر چلنے لگا تو اس
نے کہا "پتا مجھے پیاس ہے تھوڑا سا پانی ملے تو پی لوں" گورو گوبند سنگھ نے کہا "میرے

عزیز پانی تو موجود ہے لیکن تمہاری پیاس بجھانے کے لئے یہ پانی مناسب نہیں۔ تم جاکر شہادت کا شربت پیو اور اس سرخ شربت سے اپنی پیاس بجھاؤ" وہ گیا۔ تھوڑی دیر لڑکر گر پڑا۔ گورو گوبند سنگھ رات کے وقت قلعہ سے نکلے اور ایک پرانے مسلمان اُستاد کی مدد سے نیلے کپڑے پہن کر دو شاگردوں سمیت مسلمانوں کے لباس میں بھٹنڈا پہنچے۔ وہاں ان کے شاگرد جمع ہوئے۔ اورنگزیب نے دکن سے گورو گوبند سنگھ کو طلب کیا۔ گورو گوبند سنگھ نے ایک خط جسے ظفر نامہ کہتے ہیں فارسی نظم میں لکھا اور قاصد کے حوالے کیا بھائی دیا سنگھ ایک شاگرد کو بھی قاصد کے ساتھ بھیجا۔ اس خط میں سے چند فقرات نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

"شاہا! پرماتما نے تمہیں تخت وتاج دیا ہے۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ تم لوگوں کے ساتھ انصاف کرو؟ میں پہاڑوں پر رہتا تھا اور میں نے کبھی تمہارے علاقے میں دست اندازی نہیں کی تھی۔ تم نے میرے باپ کو قید کیا اور بے رحمی سے اسے قتل کیا۔ تم نے میرے معصوم بچوں اور ہزارہا شاگردوں کے گلے کٹوائے۔ میری استریوں کا خون تمہاری گردن پر ہے۔ تم نے میرا خزانہ لوٹا۔ تم شاید ان باتوں کو معمولی سمجھتے ہو لیکن پرماتما کی نظر میں یہ بڑے جرم ہیں۔ اس کی درگاہ میں شاہنشاہ اور بے حقیقت چیونٹی ایک درجہ رکھتے ہیں۔ شاید تم خیال کرتے ہو کہ تم قرآن پڑھتے ہو۔ قرآن خوانی کا کیا فائدہ ہے؟ ہزاروں طوطے کلمہ کلام پڑھتے ہیں۔ اگر انسان نیک اعمال کے ذریعے سے اپنے دل کو پوتر نہیں کرتا تو اس کی قرآن خوانی اسے دوزخ کی آگ سے بچا نہیں سکتی۔ شاید تم خیال کرتے ہو کہ تم پرماتما کی خدمت گزاری کرتے ہو۔ چار آیتوں کا پڑھ لینا کوئی خدمت گزاری نہیں۔ اپنی خواہشوں پر غلبہ پانا بھی عبادت ہے۔ تم حکومت کے نشہ میں مست ہو اور خواہشوں کے غلام ہو۔ شاید تم خیال کرتے ہو کہ تم نے بت پرستی کو کم کیا ہے اور اس کے صلہ میں تمہیں بہشت نصیب ہوگا۔ تم نے بت پرستی کو کم نہیں کیا بلکہ زیادہ کیا ہے۔ آگے ہندوؤں کے مندر تھے۔ لوگ کبھی کبھی مندروں میں جاتے تھے۔ اب تم نے مندر گرا دیئے ہیں۔ اس لئے

ہر ایک ہندو نے اپنے گھر میں بت رکھ لئے ہیں۔ شاید تم خیال کرتے ہو کہ لوگ تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ خوشامدی فرعون کی بھی تعریف کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ دوزخ کی آگ میں جھونکا گیا۔ شاید تم خیال کرتے ہو کہ پرماتما رحیم ہے اور اس لئے تمہیں بخش دے گا۔ تم کس طرح رحم کی امید کر سکتے ہو؟ تم لوگوں کو اذیت دیتے ہو پرماتما کا رحم تمہارے جیسوں کے لئے نہیں۔ آک بو کر آموں کا حاصل کرنا ناممکن ہے تم نے لوگوں پر ظلم کئے ہیں۔ اب خالصہ تمہیں اس کی سزا دے گا۔ تمہاری سزا کا دن آ پہنچا ہے۔ پرماتما کی مدد سے میں تم سے انتقام لوں گا۔ خالصہ فقط تمہاری تباہی کے لئے اٹھا ہے۔"

جب اورنگ زیب کو یہ خط ملا اس کے تھوڑی دیر بعد وہ مر گیا۔ اس کے پیچھے بہادر شاہ اور اس کے بھائیوں کے درمیان تنازعے شروع ہو گئے۔ اس موقعہ پر گورو گوبند سنگھ نے بہادر شاہ کی مدد کی اس لئے ان کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔

گورو گوبند سنگھ کی موت

پائندہ خاں ایک پٹھان تھا جو گورو ہر گوبند کے ہاتھوں سے مقابلہ میں مارا گیا تھا اس شخص کا پوتا گل خاں گورو گوبند سنگھ کے پاس پیش خدمت کی حیثیت میں ملازم ہو گیا ایک دن گورو گوبند سنگھ اور گل خاں کے درمیان حسب ذیل گفتگو ہوئی:-

گورو گوبند سنگھ ۔ خاں اگر ایک شخص کا دادا دوسرے شخص کے دادا کے ہاتھ سے قتل ہوا ہو تو پہلے شخص کے لئے دوسرے شخص کا دست نگر ہونا کیسا فعل ہے؟

گل خاں ۔ میں اسے نہایت ہی کمینہ فعل خیال کرتا ہوں۔

گورو گوبند سنگھ ۔ خاں اگر ایک پٹھان اپنے باپ دادا کے قاتل کی اولاد سے بدلہ نہ لے تو تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہے؟

گل خاں ۔ میں ایسے شخص کو پٹھان نہیں سمجھتا بلکہ جولاہا خیال کرتا ہوں۔

گورو گوبند سنگھ اور گل خاں کے درمیان اس کے بعد کئی بار یہ گفتگو ہوئی پٹھان

نے دل میں خیال کیا کہ گورو گوبند سنگھ اس سے ایسے سوال کیوں کرتے ہیں۔ اُسے معلوم ہوا کہ اس کے دادا کی جان گورو ہرگوبند سنگھ جی نے تلف کی تھی۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ جولاہا نہیں بنے گا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک مرید ایک خنجر گورو کے لئے لایا۔ گورو گوبند سنگھ نے پھر اس پٹھان سے کہا "خان اس خنجر کے کتنے وار ایک شخص کو مارنے کے لئے کافی ہیں؟" پٹھان نے کہا "ایک ہی وار کافی ہے!" گورو گوبند سنگھ نے کہا "اگر یہ خنجر تمہارے پاس ہو اور تمہارے باپ دادا کا دشمن موجود ہو تو تم کیا کرو؟" اس نے کچھ جواب نہ دیا تھوڑی دیر کے بعد سب لوگ چلے گئے۔ گورو گوبند سنگھ کی آنکھ لگ گئی اور اس پٹھان نے خنجر گورو گوبند سنگھ کے جسم میں داخل کر دیا اور آپ بھاگ گیا۔ اسی صدمہ سے تھوڑے عرصہ بعد ان کا انتقال ہوا۔ مرنے کے وقت انہوں نے سکھوں سے کہا "آج سے گرنتھ تمہارا گرو ہے۔ جب کبھی شکوک پیدا ہوں گے گرنتھ انہیں میری طرح دور کرے گا"

دسویں گورو کا گرنتھ

گورو گوبند سنگھ کا خیال تھا کہ گورو نانک کا گرنتھ جو بھگتی کی تعلیم دیتا ہے تمام انسانی ضرورتوں کے لئے کافی نہیں۔ انسانی زندگی میں سپاہیانہ جوش کی بھی ضرورت ہے۔ اس لئے انہوں نے گرنتھ میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ آدمی کرتار پور بھیجے تاکہ وہاں کے سوڈھیوں سے گرنتھ لے آئیں۔ سوڈھی ان کے اصولوں کے معتقد نہیں تھے۔ انہوں نے گرنتھ دینے سے انکار کیا اور کہا "گوبند سنگھ اپنے آپ کو گورو کہتے ہیں۔ اگر وہ درحقیقت گرو ہیں تو اپنا گرنتھ کیوں نہیں بنا لیتے؟" جب گورو گوبند سنگھ نے یہ سُنا تو انہوں نے ارادہ کیا کہ ایک نیا گرنتھ تیار کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا گرنتھ تیار کیا۔ یہ دسویں گورو کا گرنتھ کہلاتا ہے اور سکھوں کی بعض دھرم شالاؤں میں رکھا جاتا ہے۔ اس کی زبان ہندی ہے۔ نظم نہایت پُرجوش ہے۔ مضمون مختلف ہیں۔ مذہبی جوش اور سپاہیانہ زندگی کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ عورتوں کے خلاف کئی قسم کے قصے بھی درج ہیں۔

گورو گوبند سنگھ کا کیرکٹر۔ گورو گوبند سنگھ کو اپنے معرکوں کے لئے ہمیشہ

روپیہ کی ضرورت رہی لیکن روپیہ کو وہ ایک اعلیٰ مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ایک وسیلہ سمجھتے تھے۔ زر و مال کی ان کی نظروں میں کوئی قدر نہ تھی۔ ایک موقعہ پر ایک شاگرد دو قیمتی طلائی کنگن ان کے لئے لایا اور ان سے پہننے کے لئے کہا۔ پہلے تو انہوں نے انکار کیا لیکن اس کے بار بار اصرار کرنے پر وہ کنگن پہن لئے۔ دریا پر گئے اور کنگن پانی میں پھینک آئے۔ واپس آئے تو سکھ نے پوچھا "کنگن کیا ہوا؟" جواب دیا "پانی میں گر پڑا ہے"۔ اس شخص نے ایک غوطہ خور کو کنگن کی تلاش کے لئے مقرر کیا اور کنگن کے گرنے کی جگہ دریافت کی۔ گورو گوبند سنگھ اس سکھ کے ساتھ دریا پر گئے اور دوسرا کنگن دریا میں پھینک کر کہا "اس جگہ گرا ہے" وہ شخص ان کی لاپروائی کو دیکھ کر حیران ہوا اور غوطہ خور کو واپس بھیج دیا۔

گورو گوبند سنگھ میں خودداری کا خیال بڑا زبردست تھا۔ ایک موقعہ پر ایک شاگرد ان کے لئے دکن سے ایک ہاتھی۔ تلوار۔ باز۔ عربی گھوڑا اور ایک خوب صورت خیمہ لایا۔ گورو گوبند سنگھ نے حکم دیا "گھوڑے پر زین ڈالی جائے۔ ہاتھی کو سجایا جائے اور خیمہ کو کھڑا کیا جائے۔ پہاڑی راجے بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے ان چیزوں کو دیکھا اور ان پر مست ہو گئے اور کہنے لگے "یہ چیزیں ہمیں دے دو" گورو گوبند سنگھ نے کہا "میرا شاگرد یہ چیزیں میرے لئے لایا ہے۔ میں یہ چیزیں تمہیں دے سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ پہلے میں خود انہیں استعمال کروں۔ گھوڑا ہاتھی کے آگے چلے گا اور میں باز ہاتھ میں لے کر اور تلوار کمر میں لٹکا کر ہودج میں بیٹھوں گا پھر میں خیمہ میں تھوڑی دیر آرام کروں گا۔ تب تم یہ سب چیزیں لے سکتے ہو" راجوں نے اسے ہتک آمیز سمجھا۔ سکھوں نے راجوں کو گالی گلوچ دی۔ گورو گوبند سنگھ نے انہیں روک دیا۔ اس کے بعد اگر پہاڑی راجوں کی ان سے صلح ہوئی بھی تو وہ دیرپا نہیں ہو سکی۔ گورو گوبند سنگھ سر پہ کلغی اور ہاتھ میں باز رکھا کرتے تھے اور جب گھوڑے پر سوار ہوتے تھے تو تیر و کمان اور تلوار ڈھال سے مسلح ہوتے تھے ایک دفعہ اسی طرح آگرے کے قلعہ میں بہادر شاہ سے ملنے گئے۔ دروازہ پر پہنچے تو دربان نے

روک دیا اور کہا "اگر آپ اندر جانا چاہتے ہیں تو ہتھیار یہاں اتار دیں" گورو گوبند سنگھ نے ان شرائط پر ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ جب معاملہ بادشاہ تک پہنچا تو اس نے اجازت دی کہ گورو گوبند سنگھ جب چاہیں مسلح آجایا کریں۔ گورو گوبند سنگھ کی عمر بھر یہ کوشش رہی کہ مذہبی جوش اور سپاہیانہ دلیری کو ایک زندگی میں ملا دیا جائے وہ ایسی فقیری کے حق میں نہیں تھے جس میں انسان دنیا سے بے تعلق ہو جائے۔ ایک موقعہ پر ایک شخص ان کے پاس آیا اور کہا مہاراج! یہ میرا لڑکا شادی کرنے سے انکار کرتا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ گورو گوبند سنگھ نے لڑکے سے پوچھا "کہو بھائی شادی کیوں نہیں کرتے؟" اس نے جواب میں کہا "نانک صاحب نے کہا ہے یہ رشتے جو تو دیکھتا ہے تیرے ساتھ نہیں جائیں گے جو تمہارے ساتھ نہیں جا سکتے ان کے ساتھ کیوں موہ کرتے ہو؟ بھولے سے بھی ایسے کام مت کرو جن کا انجام شرمساری اور پشیمانی ہو۔ نانک جو ہر حال میں سچ کہتا ہے اس کا اپدیش سُن۔ یہی تیرے ساتھ جائے گا" گورو گوبند سنگھ نے کہا "فقیر لباس سے نہیں بنتے بلکہ دل کی پاکیزگی سے اور دنیا وار شادی وغیرہ تعلقات سے نہیں بنتے بلکہ دنیا کی چیزوں میں دل لگانے سے۔ گرہست میں بھی انسان فقیر ہو سکتا ہے۔ کنول کو دیکھو پانی میں رہتا ہے لیکن پانی اس میں اثر نہیں کرتا"

گورو گوبند سنگھ اور بندا

گورو گوبند سنگھ دکن میں تھے۔ جب بندا سے ان کی ملاقات ہوئی تو اس سے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ ان کا مددگار رہا۔ مرنے کے وقت گورو گوبند سنگھ نے بندا سے کہا "میرے باپ اور بچوں کی موت کا بدلہ لینا تمہارا کام ہے اور سکھوں کو ہدایت کی کہ وہ بندا کو اپنا لیڈر مانیں۔ بندا مسلمانوں کے ساتھ بہت عرصہ تک لڑتا رہا۔ آخر وہ ہمراہیوں سمیت پکڑا گیا۔ پہلے سب لاہور لائے گئے جہاں انہیں دُبلے بیمار گدھوں پر چڑھا کر شہر کے کوچوں میں پھرایا گیا۔ بہت سے سکھوں کو راوی کے کنارے لے گئے اور وہاں ان کے سر کاٹ کر ان کے جسم دریا

میں پھینکے گئے۔ پھر ۷۴۰ آدمیوں کو دہلی لے گئے۔ بندا ایک پنجرے میں بند تھا۔ وہاں انہیں گدھوں پر سوار کیا گیا بندا کا منہ کالا کیا گیا۔ سکھوں کو سُو سُو کرکے قتل کیا گیا۔ ان کے کاٹے ہوئے سر نیزوں پر رکھ کر بندا کو شاہانہ لباس پہنایا گیا۔ بندا اس وقت بھی دھوم پر قائم رہا۔ اس کے ہاتھ سے اس کے بیٹے کا گلا کٹوایا گیا تو بھی اس کے آنسو نہ نکلے اور وہ مضبوط رہا۔ تب اس کا کام تمام کیا گیا۔

نوٹ اس تذکرہ کے متعلق میرے پاس متعدد خطوط پہنچے ہیں۔ بعض شریف آدمیوں کی طرف سے ہیں اور بعض ناظرین شکایت کرتے ہیں کہ میں نے سکھوں کے آخری گورو کو فقط گوبند کے نام سے یاد کیا ہے۔ انہوں نے یہ دیکھنے کی پرواہ نہیں کی کہ جس وقت کے متعلق میں نے انہیں گوبند کہا ہے اس وقت ان کا نام گوبند ہی تھا۔ بعد میں انہوں نے اپنا نام گوبند سنگھ رکھا ہون کے متعلق جو حال میں نے درج کیا ہے اُسے فرضی قصہ بنایا گیا ہے ممکن ہے یہ فرضی قصہ ہو لیکن مستند تاریخوں کا ذکر آتا ہے اور یہ ایسا زباں زد عام ہے کہ اس کی لغویت کا بار ثبوت دوسرے خیال کے لوگوں پر ہے میں گورو گوبند سنگھ جی کی عزت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ سچائی کی عزت بھی میرے دل میں ہے اس لئے جب مجھے اس کے فرضی ہونے کا یقین دلایا جائے گا میں اُسے نکال دوں گا۔ بہر حال یہاں اس اختلاف رائے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

دیوان چند

حضرت محمدؐ صاحب

(از لالہ شن سہائے جی بی اے دہلی)

مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کی زندگی کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ کوئی شخص ان کا مطالعہ کرے اور ان کی تعریف کرنے پر مجبور نہ ہو۔ غیر مسلم قوموں نے اکثر اس بزرگ شخصیت پر طرح طرح کے الزام لگانے کی کوشش کی ہے لیکن انصاف کسی طرح اجازت نہیں دیتا کہ ہم ثبوت کے بغیر کسی شخص پر بھی الزامات لگائیں۔ حضرت محمدؐ صاحب کی زندگی کے تمام حالات بڑی پوری تفصیل کے ساتھ کتابوں میں موجود ہیں اور انہیں پڑھ لینے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ آپ بھی حضرت عیسیٰ اور مہاتما بودھ وغیرہ کی طرح ایک بہت بڑے اور کامیاب مصلح گزرے ہیں۔

اپنے بہت سے ہم مذہبوں کی طرح میں بھی حضرت محمد صاحب کو پہلے ایک عیش پرست اور جنگجو انسان خیال کیا کرتا تھا لیکن جب میری نگاہ سے مسز اینی بیسنٹ صاحبہ کی یہ رائے پیغمبر اسلام کے متعلق گزری کہ پیغمبر اعظم کی جس بات نے میرے دل میں ان کی عظمت اور بزرگی قائم کردی ہے وہ ان کی وہ صفت ہے جس نے ان کے ہموطنوں سے "الامین" یعنی بڑا دیانت دار کا خطاب دلوا دیا۔ اس سے بڑھ کر کوئی صفت نہیں ہوسکتی اور کوئی بات اس سے زیادہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لئے قابل اتباع نہیں ہے۔ ایک ذات جو مجسم صدق ہو اس کے اشرف ہونے میں کیا شک ہوسکتا ہے۔ ایسا ہی شخص اس قابل ہوسکتا ہے کہ پیغام حق کا حامل ہو تو مجھے شوق پیدا ہوا کہ ایسے بڑے مصلح کے حالات معلوم کروں اور جب میں نے آپ کے حالات پڑھے تو مجھے بہت افسوس ہوا کہ اس سے پہلے میں کیسی سخت غلطی میں مبتلا تھا۔

حضرت محمد صاحب ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے کہ جہاں نہ کسی قسم کی تہذیب

تھی نہ تمدن تھا۔ جہاں ذرا ذرا سی بات پر روز مرہ قبیلوں میں باہم تلواریں چلتی رہتی تھیں
جہاں لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا جاتا تھا اور جہاں خدا سے مراد وہ چند بت تھے
جو خانہ کعبہ میں رکھے ہوتے تھے۔ آپ کی قوم کو نہ علم و ہنر سے کوئی واسطہ تھا نہ اخلاق
سے اور آپس کی رات دن کی لڑائیوں کی وجہ سے ملک میں نہ کوئی سلطنت تھی اور نہ
کوئی انتظام۔ اس قدر ناموافق حالات میں اور ایسی پست اور گری ہوئی قوم میں آپ پیدا
ہوئے اور ہر قسم کی ظاہری تعلیم سے بھی محروم رہے۔ پھر بھی آپ کا کیرکٹر اتنا بلند تھا کہ تمام
قوم میں آپ سچے اور ایماندار کے نام سے مشہور ہو گئے۔ لوگ اپنا روپیہ لا لاکر آپ
کے پاس جمع کرتے تھے اور آپ کے انصاف پر اتنا بھروسہ تھا کہ اکثر ایسے مقدمے جن کا
فیصلہ اور کسی طرح نہ ہو سکتا آپ کے پاس لائے جاتے اور آپ کے فیصلہ کے آگے دونوں
فریق سر جھکا دیتے۔

آپ کے دل میں شروع ہی سے بتوں کی کوئی عزت نہ تھی اور آپ ہمیشہ اپنا
دھیان اپنے پیدا کرنے والے سے لگایا کرتے تھے۔ مکہ سے تھوڑی دور پر ایک غار میں
جا کر آپ بیٹھ جاتے اور وہاں کئی کئی گھنٹے بیٹھے ہوئے ایشور کا دھیان کیا کرتے۔ آپ
نے اپنی تمام عمر میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی آپ نے ساری عمر میں کسی کا دل نہیں دکھایا
اور سب سے بڑی بات یہ کہ جب ہزاروں کی تعداد میں آپ کے معتقد اور پیرو پروانوں
کی طرح آپ پر قربان ہونے کو تیار رہتے تھے تو اس وقت بھی کبھی آپ کے دل میں ذرا
سا بھی غرور پیدا نہ ہوا اور آپ نے کبھی اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر اور برتر خیال نہیں
کیا۔ جب آپ کہیں سے آتے تھے تو آپ کے معتقد آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو جاتے
تھے مگر آپ ہمیشہ انہیں یہ کہہ کر منع کر دیتے تھے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح میری
تعظیم نہ کیا کرو میں تو تم جیسا ہی ایک آدمی ہوں۔ آپ کے اخلاق کی یہ حالت تھی کہ آپ
لوگوں کو سلام کرنے میں ہمیشہ پیش دستی کرتے تھے اور اگر کوئی شخص آپ کا ہاتھ پکڑ لیتا
تو اس وقت تک کبھی نہ چھڑاتے جب تک کہ وہ خود نہ چھوڑ دے۔

اکثر ناواقف لوگ آپ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ آپ نے اپنے مذہب کے پھیلانے کے لئے

تلوار سے کام لیا لیکن آپ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ الزام بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے۔

شروع زمانہ میں آپ کے پیروؤں کی تعداد بہت کم تھی اور اگر وہ تلوار کا خیال بھی دل میں لاتے تو عرب کی جنگجو قومیں ایک ہی دن میں ان مٹھی بھر آدمیوں کا صفایا کر دیتیں۔ جب آپ کے معتقدوں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہوئی تب بھی وہ صرف اتنی ہی تھی کہ ہزاروں کے مقابلہ میں ایک یا دو کی نسبت ہو سکتی تھی۔ ایسی حالت میں بھی اگر آپ کی طرف سے کسی قبیلے پر کچھ زیادتی کی جاتی تو سارا کا سارا عرب آپ کے خلاف امنڈ آتا اور مسلمانوں کو کہیں پناہ نہ ملتی۔ ان باتوں سے صاف سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اگر آپ چاہتے بھی تو تلوار سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ اصل یہ ہے کہ لوگوں کو اس سبب سے دھوکا ہوتا ہے کہ حضرت محمد صاحب کو اپنی حفاظت کی خاطر کئی مرتبہ لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ عرب کے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ محمد نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے تو وہ آپ کے دشمن ہو گئے اور جس قدر آپ کا اثر پھیلتا گیا اسی قدر یہ دشمنی بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ خود اس قبیلے نے کہ جس میں آپ پیدا ہوئے تھے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ ایسی حالت میں آپ اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے کہ دشمنوں کا مقابلہ نہایت مردانگی سے کریں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور اپنی تھوڑی سی جماعت سے حملہ آوروں پر فتح حاصل کی۔ ایک لڑائی کے بعد لڑائیوں کا ایک سلسلہ بندھ گیا مگر آپ کا اقبال یاور تھا۔ آپ تقریباً ہر لڑائی میں کامیاب رہے اور ہر فتح کے بعد آپ کا اثر برابر بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ آپ نے مکہ فتح کر لیا۔ مکہ کی فتح کے بعد اک دم سارا عرب آپ کی طرف جھک پڑا اور آپ کے مذہب کو خوشی سے قبول کر لیا۔

حضرت محمد صاحب کی اس قدر عظیم الشان کامیابی کا راز درحقیقت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ آپ بالکل سچے پکے منصف اور خدا کے سوا کسی اور سے نہ ڈرنے والے انسان تھے۔ مصیبتوں اور تکلیفوں کا صبر اور تحمل کے ساتھ مقابلہ کرنا اور ان سے کبھی پریشان نہ ہونا آپ کی عادت تھی۔ مخلوق خدا کا آپ کے دل میں حد سے زیادہ

درد موجود تھا اور عرب میں عورتوں اور غلاموں کو پستی سے نکال کر بلندی پر لانا آپ کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے لئے تمام انسانوں کو ان کا ممنون ہونا چاہیئے۔

بہت سے غیر مسلموں کا حضرت محمد صاحب پر یہ بھی اعتراض ہے کہ آپ نے بہت سی شادیاں کیں اور اسے وہ اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ آپ عیش پرست اور ہوس کے بندے تھے۔ ظاہر میں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن آپ کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جو اپنی پہلی شادی خاص جوانی کے زمانہ میں کی تھی وہ بھی ایک ایسی بیوہ عورت سے کی تھی جس کی عمر چالیس سال کی تھی۔ کوئی عیش پرست نوجوان شادی کے معاملے میں ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد مسلسل پچیس سال تک یعنی جب تک آپ کی پہلی بیوی زندہ رہیں آپ نے کوئی دوسری شادی نہ کی۔ گویا جوانی کا تمام زمانہ صرف ایک بیوی کے ساتھ گزارا۔ ایک سے زیادہ آپ نے جتنی شادیاں کی ہیں وہ سب پچاس سال کی عمر کے بعد کی ہیں اور اس سے خیال کیا جانا چاہیئے کہ ان شادیوں کا مقصد ہوس رانی نہ تھا۔ خاص کر جبکہ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ سوائے ایک بیوی کے اور کوئی بھی ایسی نہ تھی جو بہت کافی عمر کی اور بیوہ نہ ہو۔ یہ شادیاں آپ نے ایسے زمانہ میں کیں کہ جب آپ سچ مچ عرب کے بادشاہ بنے ہوئے تھے اور اگر آپ کا ذرا سا اشارہ بھی ہوتا تو تمام عرب کی حسین سے حسین لڑکیاں آپ کے قدموں پر نثار کر دی جائیں۔ ایسے اختیارات حاصل ہونے پر آپ کو چالیس چالیس اور پچاس پچاس برس کی غریب بیواؤں سے شادی کرنا اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ ان شادیوں کی اصلی غرض ہوس رانی نہیں بلکہ کچھ اور ہی تھی۔

ناواقفیت بہت سی غلط فہمیوں کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اس ناواقفیت کی بدولت اکثر غیر مسلموں نے ایک نہایت شریف اور بزرگ مصلح کو خواہ مخواہ بدنام کرنے کی کوشش کی ہے جو بہت ہی قابلِ افسوس ہے۔ اعتراض کرنے سے پہلے لوگوں کو چاہیئے کہ خوب غور کے ساتھ آپ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کر لیا کریں۔

بنجمن فرینکلن

از قلم لالہ دیوان چند جی ایم اے

وہ کون سا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا؟
ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا؟

مختصر حالات زندگی

شمالی امریکہ کے شہر بوسٹن میں ۱۷۰۶ء میں بنجمن فرینکلن پیدا ہوا۔ اس کے والدین کے متعلق اتنا لکھنا ضروری ہے کہ اس کی پیدائش سے بیس سال پہلے وہ اپنے وطن انگلستان کو چھوڑ کر امریکہ میں جا بسے تھے۔ شادی کے وقت فرینکلن کے باپ کی عمر ۲۴ سال کی اور اس کی ماں کی عمر ۲۲ سال کی تھی۔ اس بر ہمچریہ کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ۸۹ اور ۸۵ سال کی عمر تک زندہ رہے۔ فرینکلن کا باپ غریب تھا ایک بڑے کنبہ کا گزارہ اس کی محنت سے ہوتا تھا۔ اس کا کام صابون اور موم کی بتیاں بنانا تھا۔

لڑکے فرینکلن کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اس لئے اس کے باپ کی خواہش تھی کہ وہ بڑا ہو کر پادری بن جائے۔ ۸ برس کی عمر میں اسے سکول میں بھیجا گیا لیکن ابھی ایک سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ خاندان کی غریبی کی وجہ سے فرینکلن کو سکول چھوڑنا پڑا۔ اسے ایک اور سکول میں داخل کیا گیا جہاں فقط پڑھنا اور حساب سکھایا جاتا تھا وہاں وہ ایک سال کے قریب رہا۔

دس برس کی عمر میں اس نے یہ سکول بھی چھوڑ دیا اور اپنے باپ کے ساتھ کام میں شامل ہو گیا۔ دوکان کی حفاظت کرنا۔ بتیاں کاٹنا اور پیغام لے جانا وغیرہ اس کے کام تھے۔ یہ کام اسے مطلق نہیں بھائے اس لئے دو سال کے بعد باپ نے اسے اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ جس نے انگلستان سے واپس آکر چھاپہ خانہ کا کام

شروع کیا تھا لگا دیا۔ فرینکلن کو اب پڑھنے کا زیادہ موقعہ ملنے لگا۔ بعض اوقات وہ رات کو کسی سے کتاب مانگ لاتا اور رات بھر میں اس کو ختم کرکے دوسرے دن واپس کر دیتا۔ جو کچھ اس کے پاس بچ رہتا وہ کتابوں کی خرید میں خرچ کرتا۔

ایک امیر سوداگر چھاپہ خانہ میں آیا کرتا تھا۔ فرینکلن میں تحصیل علم کا شوق دیکھ کر بہت خوش ہوا اسے اپنے گھر لے گیا اور اسے اجازت دی کہ اس کی لائبریری استعمال کر لیا کرے۔

دوسروں کی کتابیں پڑھتے ہوئے فرینکلن کے دل میں خیال آیا کہ وہ خود بھی کچھ لکھے۔ اس نے دو گیت لکھے اور انہیں چھاپ دیا۔ وہ جلدی ہی بک گئے۔ اس کے باپ نے ان گیتوں میں بہت سی غلطیاں دکھائیں اور کہا "شاعر اکثر مانگتے ہی دکھائی دیتے ہیں"۔ یہ سن کر فرینکلن نے شاعری کا خیال بالکل ترک کر دیا اور نثر کی طرف توجہ کی۔

ایڈیسن کے اخبار سپیکٹیٹر کی ایک پرانی جلد اسے ہاتھ لگ گئی انگریزی زباں دانی کے لحاظ سے ایڈیسن کے مضامین کا پایہ بہت بلند ہے۔ فرینکلن نے ان پرچوں کی مدد سے انگریزی لکھنے میں بہت ترقی کی اور اس طرح اس کے دل کی ایک امنگ پوری ہوئی۔

بنجمن کے بڑے بھائی کی طبیعت تیز تھی۔ بنجمن اس کے ساتھ مل کر کام نہ کر سکا اور اس نے ارادہ کیا کہ بوسٹن سے نیو یارک جائے اور وہاں جا کر کام شروع کر دے۔ رستے کے خرچ کے لئے اس نے کچھ کتابیں بیچیں۔ جب نیو یارک پہنچا تو وہاں کوئی کام نہ ملا۔ وہاں سے اسے صلاح ملی کہ فلاڈلفیا میں جائے۔ فلاڈلفیا وہاں سے سو میل کے فاصلہ پر تھا کچھ فاصلہ تری کے راستے طے کیا اور کچھ خشکی کے راستے۔ آخر فلاڈلفیا پہنچا۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا جیبوں میں میلے کپڑے بھرے تھے نہ کوئی سفارش تھی نہ وہاں کوئی واقف تھا۔ بھوک نے ستایا۔ تین پنس ایک باورچی کو دیئے اور اس سے تین بڑی بڑی روٹیاں لے لیں۔ جیبوں

ہیں گنجائش نہیں تھی۔ ایک ایک بغل میں دبالی اور دوسری دوسری بغل میں۔ اور تیسری کو کھاتا ہوا بغیر کسی خاص خیال کے بازار میں پھرنے لگا۔ اس عجیب شکل کو دیکھ کر جو لوگ حیران ہوئے اور مسکرائے اُن میں ایک لڑکی بھی تھی۔ جو بعد کو فرینکلن کی بیوی بنی وہاں کچھ عرصہ تک ملازمت کی پھر انگلستان میں گیا اور وہاں ایک چھاپہ خانہ میں ملازم ہوگیا اور دوسرے ملازم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ فرینکلن شراب نہیں پیتا۔ کچھ ہنسی ٹھٹھا بھی کیا لیکن وہ اپنے ارادے میں مستقل تھا۔ آخر اس کی مثال سے ان میں سے بعضوں پر اثر ہوا۔

ڈیڑھ سال کے قریب لندن میں رہ کر فرینکلن پھر اپنے وطن کو لوٹا اور فلاڈلفیا میں پھر پہلے آقا کی ملازمت کی۔ جب فرینکلن اس کے ان پڑھ کام کرنے والوں کو کچھ سکھا چکا تو آقا نے اس کے ساتھ لڑائی کرکے اسے موقوف کر دیا۔ اب فرینکلن نے ایک شخص کی شرکت سے کام شروع کیا بعض اوقات وہ رات کے گیارہ بجے تک بلکہ اس سے بھی بعد تک بیٹھ کر کام کرتا۔ ایک دن کام ختم کر چکا تھا کہ بنا بنایا کام بگڑ گیا۔ فرینکلن نے فرض سمجھا کہ کام کو پھر بنائے اور اس کو بنا کر آرام کیا۔ اس محنت اور کفایت شعاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اس کی عزت ہونے لگی اور آہستہ آہستہ اس کی غریبی دور ہوئی۔

فرینکلن نے اب اپنا اخبار جاری کر دیا۔ اس کے سنجیدہ مضامین کے متعلق ہر طرف چرچے ہونے لگے ۱۷۳۲ء میں اُس نے اپنی مشہور غریب رچرڈ کی جنتری شائع کی۔ اس میں اُس نے بہت سی ضرب المثلیں اور حکمت کے قول داخل کئے۔ پھر ان کو ایک کتاب کی شکل میں شائع کر دیا۔ جس کا نام شاہراہ دولت رکھا ہم اس کے کچھ فقروں کا ذیل میں ترجمہ کئے دیتے ہیں۔

دنیا میں سب سے اچھا سوال یہ ہے کہ میں اس میں کیا نیکی کر سکتا ہوں؟

وہ شخص احمق نہیں جو ہل چلاتا ہے بلکہ احمق وہ ہے جو احمقوں والے کام کرے۔

خالی تھیلے کا کھڑا رہنا مشکل ہے۔

جو لوگ بہت بولتے ہیں وہ کرتے کچھ بھی نہیں۔

خوش قسمتی کیا ہے؟ محنت کی اولاد ہے۔

فرینکلن اب آسودہ تھا۔ اس نے کئی زبانیں سیکھیں اور کئی باتیں سائنس میں دریافت کیں۔

پولیٹیکل کام

۱۷۴۷ء سے جب سے وہ کونسل کا ممبر ہوا اس نے پولیٹیکل کام میں زیادہ حصہ لینا شروع کیا۔ ۱۷۵۷ء میں وہ پبلک کام پر انگلستان میں بھیجا گیا جہاں وہ پانچ سال رہا۔ واپسی پر کونسل نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پانچ ہزار پونڈ (پچھتر ہزار روپیہ) خوشنودی مزاج کے اظہار میں اسے عطا کیا۔ ۱۷۶۴ء میں وہ پھر انگلینڈ میں گیا تاکہ وہاں پارلیمنٹ سے درخواست کرے کہ سٹیمپ ایکٹ جس کے خلاف امریکہ میں بہت ناراضگی تھی منسوخ کیا جائے۔ اس میں وہ ناکامیاب رہا ۱۷۷۵ء میں جبکہ بغاوت امریکہ میں شروع ہوگئی۔ وہ واپس لوٹا۔ ۱۷۷۸ء میں وہ امریکہ کی کانگریس کی طرف سے فرانس میں ایلچی ہو کر گیا جہاں اس کی بہت عزت و حرمت ہوئی۔ امریکہ آزادی لینے میں کامیاب ہوا۔ جب لڑائی کے بعد صلح نامہ لکھا گیا تو امریکہ کی طرف سے اس پر فرینکلن نے دستخط کیے۔ تین سال تک فرینکلن ریاست کا پریزیڈنٹ رہا۔ بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے ۱۷۸۸ء میں اس نے پولیٹیکل زندگی سے کنارہ کیا۔ ۱۱ اپریل ۱۷۹۰ء کو جبکہ اس کی عمر ۸۴ سال تھی اس کی روح نے اس جسم سے علیحدگی اختیار کی۔ جنازہ کے ساتھ بیس ہزار کے قریب آدمی تھے۔

فرینکلن کے متعلق دلچسپ تذکرے

فرینکلن کی خودنوشت سوانح عمری میں بعض تذکرے ایسے دلچسپ ہیں جن کا ذکر اس مختصر مضمون میں کرنا ضروری ہے نیچے کے تذکروں میں سے دو فرینکلن کے لفظوں میں بیان کئے جاتے ہیں۔

سیٹی کی قیمت

فرینکلن لکھتا ہے "جب میں سات برس کا بچہ تھا ایک موقعہ پر چھٹی کے دن میرے دوستوں نے میری جیبیں پیسوں سے بھر دیں۔ میں سیدھا ایک دوکان کی طرف چلا جہاں بچوں کے کھلونے بکتے تھے۔ رستے میں مجھے ایک لڑکا ملا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیٹی تھی جسے وہ بجا رہا تھا۔ اس کی آواز مجھے بہت بھائی۔ میں نے اپنے سارے پیسے اس کی نذر کئے اور اس سے سیٹی لے لی۔ سیٹی لے کر میں نے گھر کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر ہر طرف سیٹی بجاتا ہوا پھرنے لگا اور گھر کو سر پر اٹھالیا۔

جب میرے بھائی بہنوں نے اس سودے کے متعلق سنا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے سیٹی کی قیمت سے چوگنے دام خرچ کئے ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ اگر میں عقل سے کام لیتا تو اور کئی چیزیں بھی اسی قیمت سے خرید سکتا تھا۔ وہ میری بے وقوفی پر کھل کھلا کر ہنسے اور میں رنج کے مارے چلانے لگا۔ اس وقت میرا افسوس میری پہلی خوشی سے کہیں زیادہ تھا لیکن اس چھوٹے سے واقعہ نے میرے دل پر ایک دیرپا اثر کیا۔ کئی دفعہ جب مجھے کسی غیر ضروری چیز کے خریدنے کی ترغیب ہوتی میں اپنے آپ سے کہتا "سیٹی کے لئے قیمت سے زیادہ مت خرچ کرو" میں یہ کہتا تھا اور اپنا روپیہ بچا لیتا تھا۔

جب میں بڑا ہوا اور دنیا میں داخل ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ دنیا ایسے بے وقوفوں سے بھری پڑی ہے جو سیٹی کی قیمت سے زیادہ اس کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

جب کبھی میں نے کسی شہرت کے طالب کو دیکھا کہ محض حصول شہرت کی غرض سے ملکی معاملات میں شور و غل مچاتا ہے اور اپنے کاروبار میں تغافل کر کے مالی نقصان اٹھاتا ہے تو میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے "دیکھو یہ اپنی سیٹی کے لئے زیادہ قیمت خرچ کرتا ہے" جب کبھی میں نے کسی کنجوس کو دیکھا کہ نہ اسے اپنی آسائش کا خیال ہے نہ اوروں کے ساتھ بھلائی کرنے میں اسے راحت ہے نہ اسے اس بات کی پرواہ ہے کہ لوگ اس کی عزت کریں اور نہ اسے دوستوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بلکہ ایک دولت جمع کرنے کا خبط اس کے سر میں سمایا ہے تو میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے

"بھولے آدمی تم اپنی سیٹی کے لئے قیمت سے زیادہ خرچ کر رہے ہو"
اگر میں نے ایسا آدمی دیکھا جو نفیس لباس، نفیس سامان اور کرو فر پرست تھا اور ان چیزوں کے لئے اس نے قرض لیا تھا اور انجام کار جیل خانہ میں بھیجا گیا تو میں نے کہا "افسوس اس شخص نے کتنی زیادہ قیمت سیٹی کے لئے دی ہے"!
الغرض میں نے خیال کیا کہ دنیا میں انسانی تکالیف کے ایک بڑے حصہ کا سبب یہ ہے کہ لوگ چیز کی قیمت لگانے میں غلطی کرتے ہیں اور سیٹی کے لئے مناسب سے بہت زیادہ قیمت دیتے ہیں"۔

سان چلانا

اوائل عمر کے متعلق مجھے یاد ہے کہ موسم سرما میں ایک دن صبح کے وقت ایک شخص جس کے لبوں پر تبسم تھا کلہاڑی کندھے پر رکھے ہوئے مجھے ملا۔ سلام کر کے اس نے مجھ سے کہا "میرے عزیز! کیا تمہارے باپ کے کوئی سان بھی ہے؟" میں نے جواب میں کہا "ہاں صاحب ہے تو سہی"۔ اس شخص نے کہا "تم کیسے اچھے لڑکے ہو کیا تم مجھے اپنی سان پر اس کلہاڑی کو تیز کرنے دو گے؟" اس اجنبی نے جو مجھے اچھا لڑکا کہا تو مجھے یہ کلمے بہت پسند آئے اور میں نے کہا "کیوں نہیں لیکن سان نیچے دکان میں پڑی ہے"۔ اجنبی نے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا اور کہا "تھوڑا سا گرم پانی ضروری ہوگا کیا تم لاؤ گے؟" مجھ سے انکار کیونکر ہو سکتا تھا؟ میں بھاگا بھاگا گیا اور ایک لوٹا بھر لایا۔ اجنبی نے مجھے تو بولنے کی فرصت ہی نہیں دی لیکن خود کہا "تم کتنے سال کے ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟ یقین جانو تم سا بھلا لڑکا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ دو چار منٹوں کے لئے سان تو گھمانا"!

اس خوشامد سے میں پھولا نہ سمایا اور احمقوں کی طرح کام کرنا شروع کیا۔ کام بھی ایسا کیا کہ بری گت ہو گئی۔ کلہاڑی نئی تھی اور سان گھماتے گھماتے میرا جسم ٹوٹنے لگا۔ سکول کی گھنٹی بجی میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے مگر کلہاڑی کا کام ابھی آدھا بھی نہ ہوا تھا۔ سکول سے غیر حاضر رہا اور سان گھماتا رہا۔ آخر کلہاڑی تیز ہوئی

اجنبی نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا "نالائق لڑکے تم آج سکول سے غیر حاضر رہے ہو۔ جاؤ بھاگ کر سکول میں پہنچو۔ نہیں تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا" میں نے دل میں کہا "ایسی سردی میں سان گھمانا ہی کافی مصیبت تھی۔ اب تو اس نے نالائق کہہ کر زخم پر نمک چھڑک دیا ہے" میرے دل میں یہ بات کھب گئی اور اس کے بعد میں نے کئی دفعہ اس کا خیال کیا ہے۔

جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک دکاندار اپنے گاہکوں کے ساتھ کمال ادب سے پیش آتا ہے اور اپنی چیزوں کو سامنے میز پر رکھتے ہوئے اُن سے کہتا ہے "تھوڑی برانڈی تو نوش کریں" مجھے خیال آتا ہے کہ اس شخص کو کلہاڑی تیز کرانا ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص ظالم ہے لیکن لوگوں کی خوشامد کرتا ہے اور اپنے آپ کو آزادی کا دوست بتاتا ہے تو میں کہتا ہوں "لوگو! دیکھو یہ شخص تمہیں سان گھمانے پر لگانا چاہتا ہے" جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص جس میں کوئی وصف ایسا نہیں جس سے وہ قابلِ عزت اور مفید بن سکے پارٹی سپرٹ کی بدولت اعلیٰ رتبہ پر پہنچتا ہے تو میں کہتا ہوں "بھولے ہوئے لوگو! تمہاری قسمت میں لکھا ہے کہ اس موسم میں تم ایک احمق کے لئے سان گھماؤ"

جھک جاؤ

جب فرینکلن نوجوان تھا۔ ایک دن وہ ایک عیسائی پادری سے ملنے گیا۔ جب بات چیت ہو چکی تو پادری نے اُسے باہر جانے کے لئے پچھلی طرف سے ایک دروازہ دکھایا۔ جب وہ ایک تنگ راستے سے گزر رہا تھا۔ پادری نے کہا "جھک جاؤ" فرینکلن نے بات کا مطلب نہ سمجھا اور ایک قدم اور اٹھایا۔ راستے کے اوپر ایک شہتیر بڑھا ہوا تھا۔ فرینکلن کا سر اُس سے جا لگا۔ پادری نے کہا "میرے عزیز! تم نوجوان ہو اور دنیا تمہارے آگے ہے۔ زندگی کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے جھکنا سیکھو تو بہت سی ٹھوکروں سے بچ جاؤ گے" فرینکلن اس بات پر لکھتا ہے "تاہم اچھی طرح سے مناسب محل پر جھکنے کا سبب ایسا نہیں کہ ہم اُسے آسانی سے سیکھ سکیں۔ جب ایک شخص تمہارے سامنے طیش و غضب میں ہے اور

بیہودہ بکواس کر رہا ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ غلطی پر ہے اور غیر معقول ہے تو یہ حماقت ہے کہ تم بھی اس کی طرح جوش میں آجاؤ اور اونچا بولنا شروع کر دو۔ اگر تم ایسا کرو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عارضی پاگل کی جگہ تم دو پاگل بناتے ہو۔ جھک جاؤ جیسا تم طوفان کے گزرنے کے وقت جھک جاتے ہو۔

تند ہوا کے سامنے جھک جانا کوئی ہتک آمیز کام نہیں۔ جیسا ایک مست سانڈ کے مقابلہ میں غرانا جہالت ہے۔ ویسا ہی پاگل کے شور و غل کا جواب دینا حماقت ہے" جھک جاؤ اور جب طوفان کی تندی کم ہو نرم الفاظ استعمال کرو جن سے غصہ دور ہوتا ہے۔

جب تم کو تمہاری غلطی زیادتی یا سستی کے لئے ملامت کی جائے تو جھک جاؤ کسی صریح غلطی کے حق میں وجوہات دینا نہ شروع کر دو۔ اس سے تو غلطی اور بڑھ جاتی ہے۔ اس سے تو طیش میں زیادتی ہوتی ہے جھک جاؤ۔

اگر تم نرمی سے کہو "میں جانتا ہوں مجھ سے غلطی ہوئی معاف کرو" ان الفاظ سے شکایت کرنے والے کا جوش ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں نے خود تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ اس طریق عمل کا نتیجہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ایک دوست میرے پاس آیا منہ غصہ سے لال تھا اور معلوم ہوتا تھا ابھی کڑکتا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مجھ سے ایک اقرار پورا نہیں ہو سکا۔ جب میں نے دیکھا کہ طوفان آیا چاہتا ہے تو جونہی وہ میرے پاس آیا میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور کہا "مجھے سخت افسوس ہے کہ میں بھول گیا تھا۔ اس دفعہ تو معاف کرو" وہ کیا کر سکتا تھا اس کے لبوں پر مہر لگ گئی۔

فرینکلن کا کیرکٹر

فرینکلن کے کیرکٹر کے متعلق مفصل بحث کے لئے یہاں گنجائش نہیں۔ فقط دو تین امور کا ذکر کیا جاتا ہے۔

آزادی طبع اور سادگی

فرینکلن میں خاص طور پر نمایاں تھی جب وہ بھائی کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا تو اسے

دوسرے لوگوں کے ساتھ کھانا ہوتا تھا۔ اس نے بھائی سے درخواست کی کہ جتنا اُس کی خوراک پر خرچ آتا ہے اس سے آدھا اُسے دیا جائے اور اُسے دوسروں کے ساتھ کھانا کھانے سے آزاد کیا جائے۔ اس کے بھائی نے اُسے بخوشی منظور کیا۔ فرینکلن نے اس نصف کے آدھے حصہ پر گزارہ کرنا شروع کیا اور باقی نصف سے کتابیں خریدنے لگا۔ جب فرینکلن کچھ متمول ہو گیا اس وقت بھی اس کی کفایت شعاری کم نہیں ہوئی مٹی کا پیالہ اور لکڑی کا چمچہ اس کے گھر میں کافی سمجھے جاتے تھے۔ ایک دن اُس کی عورت نے اس کی غیر حاضری میں ایک چاندی کا چمچہ اور چینی کا پیالہ خرید لیا۔ فرینکلن اسے قابل ذکر واقعہ خیال کر کے خود نوشت سوانح عمری میں بیان کرتا ہے۔

فرینکلن ہمیشہ اپنی زندگی کی قیمت سمجھتا تھا اور اس نے کبھی اپنے اصول سے گرنا قبول نہیں کیا۔ جس وقت اس نے اخبار میں کچھ زبردست پولیٹیکل مضامین لکھنے شروع کئے۔ اُسے دوستوں نے اطلاع دی کہ ان مضامین سے اونچے طبقوں میں بہت ہل چل مچ گئی ہے اور بعض امیر لوگ اس سے ناراض ہو گئے ہیں۔ اسے یہ بھی صلاح دی گئی کہ وہ معافی مانگنے کے لئے اور مضمون لکھے یا طرز تحریر بدل دے جس سے امیر لوگ اس کے مربی اور مددگار بنے رہیں۔ فرینکلن نے شانتی سے سب کچھ سُنا اور کہا "کچھ مضائقہ نہیں میں اپنی پوزیشن صاف کر دوں گا" اس کے بعد اُن امیروں کو کھانے کی دعوت دے دی۔ وہ تشریف لے آئے کھانا آیا اور میزوں پر چنا گیا۔ فرینکلن نے کہا "صاحبان کھانا شروع کریں" مہمانوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے نہایت ادنیٰ درجہ کا روکھا سوکھا کھانا جو مزدوروں اور کسانوں کے لائق تھا رکھا گیا ہے۔ سب نے سمجھا کہ فرینکلن نے ہتک پر ہتک کا اضافہ کر دیا ہے بہتیرے لال پیلے ہو گئے مگر خاموش رہے۔ فرینکلن اپنے کام میں مست تھا اور جب امیر لوگ ایک دوسرے کی طرف حیرت اور غصہ کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ فرینکلن سر نیچا کر کے کھانا کھاتا رہا۔ اس نے اس بات کی پروا نہیں کی کہ مہمان کھانا کھاتے ہیں یا خالی بیٹھے ہیں۔ جب کھانا کھا چکا اور اُٹھا تو مہمانوں کو مخاطب کر کے

کہا "صاحبان! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ میرے مضامین کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہیں۔ نیز آپ کی مدد جاری رہنے کے لئے ضروری ہے کہ میں معافی مانگوں یا طرز تحریر بدل لوں۔ اگر آپ اس وقت تک نہیں سمجھے تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو شخص روکھی سوکھی روٹی پر گزارہ کر سکتا ہے اسے امیروں کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

پرماتما پر وشواس اس کی زندگی میں خاص طور پر عیاں تھا۔ جب امریکہ انگلستان سے لڑ کر آزادی حاصل کر چکا تو نئی گورنمنٹ کے لئے قواعد بنانے کا کام بڑا اہم تھا۔ پہلے تو کچھ کام ہوتا رہا۔ لیکن بعد میں نا اتفاقی کے سبب سے کام بالکل بند ہو گیا اور سارا وقت بحث مباحثہ میں گزرنے لگا۔ آخر ایک دن فرینکلن نے ایک مختصر تقریر کی جس سے اس کی دھارمک حالت کا پتہ لگتا ہے۔ اس نے کہا "برطانیہ سے جب ہمارا مقابلہ شروع ہوا تو ہمیں خطرہ محسوس ہوتا تھا اور ہم روز اس کمرہ میں پرماتما سے رکھشا کے لئے پرارتھنا کرتے تھے۔ پرماتما نے ہماری پرارتھنا سنی اور دیا سے اس کا جواب دیا جو لوگ اس مقابلہ میں شامل تھے انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ بارہا پرماتما نے ہماری مدد کی۔ آج ہمیں اپنی آئندہ بہبودی کے متعلق امن و امان میں سوچنے کا موقعہ ملا ہے۔ یہ پرماتما کی دیا ہے۔ کیا اب ہم اس طاقت کو بھول گئے ہیں؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی مدد کی ضرورت نہیں؟ میں بے عمر رسیدہ ہوں اور جوں جوں میری عمر بڑھتی جاتی ہے مجھے اس سچائی کے قطعی ثبوت ملتے جاتے ہیں کہ انسانوں کے کاموں میں پرماتما کا راجیہ اور دخل ہے۔ اگر ایک چڑیا زمین پر ماتما کے علم کے بغیر نہیں گر سکتی تو یہ کب ممکن ہے کہ ایک مملکت اس کی مدد کے بغیر اُٹھ سکے؟ میں تجویز کرتا ہوں کہ ہر صبح یہاں کام شروع کرنے سے پہلے پرماتما سے مدد اور برکت کے لئے پرارتھنا کی جائے اور شہر کے ایک یا زیادہ پادریوں سے ایسی پرارتھنا کے لئے درخواست کی جائے۔"

فرینکلن خود نوشت سوانح عمری کے شروع میں ہی لکھتا ہے "میں بڑے

انکسار سے اس بات کا اقرار کرنا چاہتا ہوں کہ میری گذشتہ زندگی کی خوشی پر ماتما کی مہربانی سے تھی۔ اس سے مجھے وہ ذریعہ معلوم ہوئے جو میں نے استعمال کئے اور اس سے مجھے کامیابی ہوئی۔"

فرینکلن میں اپنے ہم وطنوں کی سیوا کا خیال (پبلک سپرٹ) کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ جہاں کہیں اُسے اپنے ہم وطنوں کی زندگی میں کوئی نقص نظر آتا اس نقص کے رفع کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت اُسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ لوگ اس کا ساتھ دیں گے یا اس کی مخالفت کریں گے۔ اسے اپنی کوششوں میں کامیابی ہوگی یا اُسے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ فرینکلن کی زندگی ہمیں سکھاتی ہے کہ ایک معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس کی پشت پر کوئی طاقت نہ ہو رفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی لینے سے لوگوں کا بہت بھلا کر سکتا ہے۔ فرینکلن کی پبلک سپرٹ کے بے شمار ظہور ہوئے۔ اُن میں سے بعض کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

(ا) شہر میں گھروں کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ فرینکلن کی کوشش سے اہالیان شہر پر ان کی مالی حیثیت کے مطابق ٹیکس لگائے اور اس سے پولیس کا انتظام کیا گیا۔

(ب) شہر میں آتش زدگی کے روکنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ فرینکلن کی کوشش سے تیس آدمیوں نے مل کر ایک سوسائٹی بنائی جس کے ہر ایک ممبر کے لئے فرض تھا کہ ہر وقت گھر میں ایک مقررہ تعداد۔ ڈولوں۔ ٹوکروں اور تھیلوں کی موجود رکھے تاکہ ضرورت کے وقت کام آ سکیں۔ اس کمپنی کے بعد اس قسم کی اور کمپنیاں بنائی گئیں۔ تھوڑے عرصہ میں ہی سارے شہر میں خاطر خواہ انتظام ہو گیا۔

(ج) سپین اور انگلستان کے درمیان جھگڑے تھے۔ لوگ گورنمنٹ کے انتظام کو تسلی بخش نہیں سمجھتے تھے۔ فرینکلن نے کوشش کی کہ لوگ اپنے طور پر ملک کی حفاظت کے قابل ہوں۔ دس ہزار سے زیادہ آدمیوں نے ہتھیار خرید لئے اور اُن کی کمپنیاں اور رجمنٹیں بنائی گئیں۔

(د) فرینکلن کی کوشش سے ایک سکول کھولا گیا جو فلاڈلفیا یونیورسٹی کی ابتدا ہے۔

(س) ایک ڈاکٹر نے فرینکلن کے پاس آکر کہا "میں کوشش کرتا ہوں کہ یہاں ایک شفاخانہ قائم کیا جاوے۔ لوگ مجھ سے تمہاری رائے پوچھتے ہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ تم سے میں اس بات کو بہتر سمجھتا ہوں تو کہہ دیتے ہیں اچھا سوچیں گے" فرینکلن نے تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے کوشش کی ہزاروں روپے پبلک نے اور ہزاروں گورمنٹ نے دیئے اور شفاخانہ قائم ہو گیا۔

فرینکلن کی پبلک سپرٹ کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا کافی ہے کہ لوگ اسے خالی پاکر ہر ایک نیک کام کے لئے ذمہ دار بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک موقعہ پر فرینکلن نے کہا "میں کبھی عہدہ حاصل کرنے کی خواہش نہیں کرتا۔ میں کسی عہدہ کو قبول کر کے اس سے کبھی استعفیٰ نہیں دیتا۔"

فرینکلن کے اقوال

(۱) میں ہر حالت میں سچ بولوں گا۔ کسی شخص کو امیدیں نہ دلاؤں گا۔ جن کا پورا ہونا اغلب نہیں۔ اپنے قول و فعل میں صادق و بے یار رہنے کی کوشش کروں گا۔ ایک سمجھ دار انسان میں یہی سب سے زیادہ دل پسند خوبی ہے۔

(۲) جو کام ہاتھ میں لوں گا اُسے محنت سے کروں گا۔ جلدی سے دولت مند بن جانے کی کوئی بیہودہ تجویز میرے دل کو اپنے کام سے اچاٹ نہیں کرے گی محنت اور استقلال افراط کے لئے ضروری ہیں۔

گارفیلڈ

(از لالہ دیوان چند جی ایم اے)

مختصر حالات زندگی

امریکہ کی ریاست ہائے متحدہ میں پچھلی صدی کے شروع میں اکثر غریب کسان جنگلوں میں جاکر زمین صاف کرتے تھے اور وہاں جھونپڑے بناکر زمین کو آباد کرتے تھے۔ ایک ایسے جھونپڑے میں جس میں سونے کے لئے چارپائیاں بھی نہیں تھیں گارفیلڈ نومبر ۱۸۳۱ء میں ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوا۔ گارفیلڈ کی عمر دو سال کی تھی۔ جب جنگل میں آگ لگ گئی۔ اس کے باپ نے مردوں کی طرح آگ بجھانے کی کوشش کی۔ جب تھک کر چور ہو گیا تو ذرا آرام کرنے بیٹھا۔ یہ آرام اس کی موت کا پیش خیمہ تھا۔ اسی سے اسے ایک بیماری لاحق ہو گئی اور وہ مہلک ثابت ہوئی۔ مرتے ہوئے اُس نے اپنی عورت سے کہا "اس جنگل میں میں نے چار پودے لگائے ہیں ان کی حفاظت کرنا اب تمہارا کام ہے"۔

بیچاری بیوہ کے سر پر بہت سا قرضہ تھا۔ اس نے دوستوں سے مشورہ کیا ایک نے کہا "زمین کو بیچ کر قرضہ بے باق کر دو اور اپنے رشتہ داروں کے پاس واپس چلے جاؤ" اس نے کہا "اب تو گذارے کی ایک سبیل ہے۔ اگر زمین بھی جاتی رہی تو گزارہ کیسے کریں گے؟ اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنا ضروری ہے" صلاح کار نے کہا "تمہارے رشتہ دار تمہاری مدد کریں گے"۔ بیوہ نے کہا "ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ وہ ہماری مدد کریں لیکن میں دوسروں کی دست نگر نہیں رہ سکتی" زمین کا کچھ حصہ فروخت کیا گیا اور جس طرح بن پڑا مصیبت کے دن کاٹے۔ گارفیلڈ کی ماں نے تین بار سے دو بار پھر دن میں ایک بار کھانا شروع کر دیا۔ مزدوری

پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگی۔ اس کا بڑا بھائی جو دس گیارہ برس کا تھا دوسرے کسانوں کے کھیتوں میں مزدوری کرنے لگا۔

ابتدائی تعلیم

گارفیلڈ کی عمر تین اور چار برس کے درمیان تھی جبکہ ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ایک مدرسہ کھولا گیا۔ گارفیلڈ کی بہن ننھے گارفیلڈ کو کندھوں پر اٹھا کر سکول میں لے گئی۔ سکول میں داخل ہوتے اُسے تھوڑے دن ہی ہوئے تھے کہ استاد اور لڑکوں کی آنکھیں اس کی خداداد ذہانت اور حافظہ کی وجہ سے اس کی طرف لگ گئیں اور چھوٹے بڑے اس کو پیار کرنے لگے۔ ایک دن ایک بڑی جماعت کے لڑکے آسے اُٹھا کر لے گئے اور میز پر بٹھا کر کہا "گارفیلڈ تم ہمارے استاد ہو اور ہم تمہارے شاگرد ہیں۔ تم ہم سے سوال کرو لیکن دیکھو کوئی مشکل سوال نہ ہو" گارفیلڈ نے کہا "اچھا قطار میں اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاؤ" لڑکے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ گارفیلڈ کو گھر میں انجیل کے قصے اختصار سے سُنائے گئے تھے۔ اس نے ان قصوں کے متعلق سوال کرنے شروع کئے۔ بعض سوالوں کے جواب لڑکے دیتے تھے لیکن بعض سوالات درحقیقت مشکل تھے۔ جن کے جواب لڑکوں کو نہیں آتے تھے۔ گارفیلڈ خود انہیں ان کے جواب بتا دیتا تھا۔ یہ ایک عجیب نظارہ تھا کہ چار برس کا بچہ اپنے سے عمر میں بڑوں کا برائے نام نہیں بلکہ درحقیقت استاد بنا ہوا ہو۔ غالباً ایسے نظارے کا فخر کسی اور سکول کو نصیب نہیں ہوا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد گارفیلڈ کی ماں نے محسوس کیا کہ اگر کوئی سکول نزدیک ہو جائے تو گارفیلڈ کی تکلیف کم ہو جائے۔ اس نے خود اپنی زمین میں سے ایک ٹکڑا اس مطلب کے واسطے دیا اور سات آٹھ آدمیوں نے مل کر ایک مختصر سا مکان تین چار دن میں کھڑا کر دیا۔ دوسرے علاقہ سے ایک استاد کو وہاں لے آئے۔ اُستاد دوں کی حیثیت اور لیاقت معمولی ہوتی تھی۔ اُستاد باری باری لڑکوں کے گھروں میں روٹی کھایا کرتے تھے۔ پہلے اُستاد گارفیلڈ کے گھر آ ٹھیرا۔ گارفیلڈ کو دیکھ کر اُستاد متاثر ہوا جب پہلے دن وہ دونوں نے سکول میں گئے تو رستے میں اُستاد نے کہا " دیکھو ابرام

کی سواری جا رہی ہے۔ گارفیلڈ کو معلوم نہیں تھا کہ جرنیل کیا ہوتا ہے۔ نہ ہی اس نے استاد سے پوچھا لیکن اتنا خیال اُسے ضرور رہا کہ جرنیل کوئی بڑا آدمی ہوتا ہے۔ دن بھر اُسے جرنیل بننے کا خیال رہا۔ واپس آتے ہی ماں سے کہا۔ "ماں جرنیل کیا ہوتا ہے؟" ماں نے اس سوال کی وجہ پوچھی اور جب حقیقت معلوم ہوئی تو کہا "بیٹا تمہارے بزرگ لڑائیوں میں اکثر لڑتے رہے ہیں لیکن معمولی حیثیت میں۔ اگر تم جرنیل بن جاؤ تو تمہارا وہ نام اور مان ہوگا جو تمہارے بزرگوں میں سے آج تک کسی کا نہیں ہوا" یہ سُن کر گارفیلڈ کی خواہش زیادہ زبردست ہوگئی اور اس نے کہا "بہرحال میں جرنیل بننے کی کوشش کروں گا"

گارفیلڈ کا بڑا بھائی باہر ملازمت کے لئے گیا۔ گھر کا سارا کام گارفیلڈ کے سر پر آ پڑا۔ اس لئے اس کی باقاعدہ تعلیم بند ہوگئی۔

محنت مزدوری کے دن

جب بھائی کچھ روپیہ کما کر لایا تو انہوں نے ایک مکان بنانے کی صلاح کی۔ معمار لگایا گیا۔ اثنائے کام میں معلوم ہوا کہ گارفیلڈ معمار کا کام کر سکتا ہے۔ اس کے بعد جہاں کہیں ضرورت ہوتی وہ معمار کا کام کرتا اور کچھ کما لیتا۔

گارفیلڈ پندرہ سال کا تھا جب ایک شخص نے جو صابون بنانے کا کام کرتا تھا اُسے ملازم رکھ لیا۔ اس شخص کے گھر کئی کتابیں اُسے پڑھنے کے لئے مل گئیں۔ ان میں سے بعض سبق آموز تذکروں سے پُر تھیں۔ ان کو پڑھ کر اُس کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے ایک دن گارفیلڈ شام کے وقت مطالعہ میں مصروف تھا جبکہ کمرے کے دوسرے حصہ میں آقا کی لڑکی ایک نوجوان سے بات چیت کر رہی تھی۔ ان دونوں کو کچھ دنوں میں میاں بیوی بننا تھا اور انہیں یہ امر ناگوار گزرا کہ گھر کا ایک ملازم انہیں آزادی سے بات چیت نہیں کرنے دیتا۔ لڑکی نے کہا "میری رائے میں اس وقت مزدوروں کو سو جانا چاہیئے" گارفیلڈ کے دل میں یہ الفاظ چبھے۔ اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا کہ گھر میں اس کی کیا حیثیت ہے۔ اسی رات اس نے فیصلہ کیا کہ وہ

مزدور سے کچھ بہتر بنے گا۔ صبح ہوئی اس نے اپنا مختصر اسباب باندھا اور تنخواہ کا
کا فیصلہ کر کے گھر چلا گیا۔

ملاح کا کام۔ زندگی کا پلٹ

کچھ دنوں کے بعد گارفیلڈ کے دل میں خواہش ہوئی کہ وہ سمندر پر ملاح کا کام کرے۔ ماں نے کہا "اس کام میں کیا دھرا ہے جو تم اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہو"؟ گارفیلڈ نے کہا "ماں! میں جہاز کا کپتان بن سکتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جہاز کا کپتان بنوں" ماں نے اس کے اصرار پر اجازت دے دی۔ وہ جا کر ایک بڑی کشتی پر جس میں اس کا ایک نزدیکی رشتہ دار کپتان تھا ملازم ہو گیا۔ وہاں ایک موقعہ پر ایک کپتان لیچر نامی سے اس کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت لیچر اور گارفیلڈ کے درمیان ذیل کی گفتگو ہوئی۔

لیچر۔ گارفیلڈ! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہارا دماغ اس لئے نہیں بنا کہ تم اپنی زندگی اس طرح خرچ کرو۔

گارفیلڈ۔ تو پھر کیا کروں؟

لیچر۔ جاؤ پانچ چھ ماہ کسی سکول میں پڑھ لو اور پھر کسی معمولی سکول میں استاد بن جانا۔

گارفیلڈ۔ ہاں۔ کہنے کو تو یہ کام آسان ہے۔ اچھا تمہاری رائے میں میرے لئے سمندر پر جانا مفید نہیں ہوگا؟

لیچر۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں تمہارے لئے ایسی زندگی کے حق میں نہیں۔ یہ کام نہایت سخت ہے اور یہ افسوس کی بات ہوگی۔ اگر تم اپنی لیاقت سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ اور ان پڑھوں کا سا کام کرتے رہو۔ اس وہم کو سر سے نکال دو۔

گارفیلڈ۔ لیکن میرا ارادہ یہ تو نہیں کہ میں ساری عمر ملازم ہی رہوں گا۔ میرا ارادہ کپتان بن کر حکومت کرنے کا ہے۔

لیچر۔ حکومت کرو یا ملازمت کرو۔ اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ دونوں صورتوں میں

میں یہ کام ایسا نہیں کہ تمہاری قابلیت کا آدمی اسے کرے۔ اپنی قابلیت کا بہترین استعمال نہ کرنا میرے خیال میں بدقسمتی ہے۔ کپتان گارفیلڈ بھی کہلایا تو کیا بن جائے گا؟ جب تم اُستاد یا گورنر بن سکتے ہو تو ملاح بننے کی خواہش کرنا حماقت ہے
لیکچر کے جانے کے بعد گارفیلڈ دیر تک ان خیالات پر بچار کرتا رہا اور حق تو یہ ہے کہ اس گفتگو نے اس کی زندگی کی دنیا بدل دی۔

اسی اثنائے میں ایک اور واقعہ ہوا جس نے گارفیلڈ کی زندگی پر اس گفتگو سے بھی زیادہ اثر کیا۔ گارفیلڈ کام میں بہت دلچسپی لیتا تھا اس لئے قدرتی امر تھا کہ کئی دفعہ وہ نہر میں گر پڑے۔ دو تین ماہ کے عرصہ میں جبکہ وہ کشتی پر ملازم تھا وہ چودہ بار نہر میں گرا۔ پہلی دفعہ جب باہر آچکا تو کپتان نے کہا "گارفیلڈ نیچے نہر میں کیا کرتے تھے؟" گارفیلڈ نے کہا "کچھ نہیں نہانے گیا تھا تاکہ تازہ ہو جاؤں" آخری دفعہ جب وہ گرا تو قریباً موت کے مُنہ میں گرا۔ ایک رات جبکہ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی اُسے جگایا گیا تاکہ اپنی باری کا کام کرے۔ آنکھیں ملتا ملتا گارفیلڈ آیا اور ایک موٹے رسّے کو کھینچا۔ رسّا ایک درز میں پھنس گیا۔ دو تین بار جھٹکا۔ باہر نہ نکلا۔ پھر زور لگایا۔ رسّہ تو نکل گیا لیکن گارفیلڈ پانی میں جا پڑا۔ رات اندھیری تھی کوئی اسے دیکھتا نہ تھا جو مدد کر سکے۔ اتفاق سے اس کا ہاتھ رسّے میں پڑ گیا اور پھر رسّا ایک درز میں پھنس گیا۔ اس رسّے کو پکڑے ہوئے گارفیلڈ اوپر چڑھ آیا۔ جب باہر نکلا تو اس کے دل میں یہ خیالات آئے "آج جو میری زندگی بچی ہے اس میں ضرور پرماتما کا ہاتھ ہے۔ اگر ایک شگاف میں گانٹھ پھنس نہ جاتی تو میں زندگی کا خاتمہ تھا۔ آج کا بچاؤ معجزہ ہے اور معجزے کرنا پرماتما ہی کا کام ہے، معلوم ہوتا ہے پرماتما کی نظر میری زندگی بچانے کے لائق ہے۔ مجھے ایسی زندگی کو لاحول کا کام کر کے ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور نہ میں ضائع کروں گا۔ آج سے یہ خیال دل سے دور ہوں گے اور میں تعلیم حاصل کروں گا گارفیلڈ نے پھر کئی بار زور سے رسّے کو جھٹکے دیئے لیکن وہ اس شگاف میں نہ پھنسا اس سے اُسے اور بھی یقین ہو گیا کہ اس کی رکھشا میں پرماتما کا خاص ہاتھ ہے۔

کچھ دنوں کے بعد گارفیلڈ ملازمت چھوڑ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچا اور ماں سے سب حال بیان کیا۔ ماں نے ایک دن کہا "گارفیلڈ! تم زندگی کی قیمت سمجھو۔ ان ٹنٹوں میں کیا دھرا ہے؟ کب یہ وہم تمہارے سر سے نکلیں گے؟ میں چاہتی ہوں تم محسوس کرو کہ تمہاری خدمت اور محبت پر سب سے مقدم حق پرماتما کا ہے۔ کیا تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ اپنا دل پرماتما کے ارپن کر دو اور موجودہ زندگی سے زیادہ مفید زندگی بسر کرو؟ یہ تمہاری سوچ کے لئے سب سے اعلیٰ مضمون ہے۔ اگر تم اپنی طاقتوں کو پرماتما کی شکر گزاری میں لگا دو تو اس سے بہتر ان کا استعمال نہیں ہو سکتا۔ اگر تم پرماتما کی خدمت نہیں کرتے تو اپنی طاقتوں کا بہترین استعمال نہیں کرتے۔ تعلیم حاصل کرو اور مذہبی پرچارک بن جاؤ یا تعلیم کا کام زندگی کا مشن بنا لو۔"

گارفیلڈ نے تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا وہ ایک ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس سے کہا "آپ میرا معائنہ کریں اور بتائیں کہ سکول میں جانا میرے لئے مفید ہے یا نہیں؟" ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور کہا "تمہارے دماغ کی حالت بہت اچھی ہے۔ جاؤ خوب محنت کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم دنیا میں اپنا نشان چھوڑو گے۔"

سکول کی تعلیم

گارفیلڈ جیسٹر سکول میں داخل ہو گیا۔ سکول کے وقت سے پہلے اور اور بعد کو اس نے ایک بڑھئی کے ہاں کام کرنے کا انتظام کر لیا جس سے معمولی گزارہ چل جاتا تھا۔ ہرم کے سکول کی حالت بہت اچھی تھی۔ اس لئے گارفیلڈ ۱۸۵۱ء میں جبکہ اس کی عمر ۱۹ سال کی تھی ہرم میں گیا۔ سکول کے دروازے پر پہنچا تو دربان سے کہا "میں پرنسپل صاحب سے ملنا چاہتا ہوں" دربان نے جواب دیا "پرنسپل صاحب اندر منتظم کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں" گارفیلڈ نے کہا "پوچھو کہ میں وہاں حاضر ہو سکتا ہوں؟" دربان گیا اور اجازت لے آیا۔ گارفیلڈ اندر گیا۔ ادب سے سلام کیا اور اپنا نام و سکونت وغیرہ بیان کئے۔ اس وقت پرنسپل سے ذیل کی گفتگو ہوئی

پرنسپل۔ کیا تم اس سکول میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو؟

گارفیلڈ۔ حضور یہی خواہش ہے۔ بشرطیکہ کوئی کام کرنے کے لئے مل جائے

پرنسپل۔ تم کیا کام کرسکو گے؟

گارفیلڈ۔ جو کام مل جائے۔ میں نے سنا ہے کہ آج کل سکول میں گھنٹی بجانے اور احاطہ اور کمرے صاف کرنے کے لئے ملازم درکار ہیں۔ اگر یہ دونوں کام مجھے مل جائیں تو زہے قسمت میرا گزارا ہو جائے گا۔ یہ سُن کر سکول کے منتظم بہت خوش ہوئے اور انہوں نے امداد کا وعدہ کیا۔ پرنسپل نے پھر کہا "اگر تم ان کاموں کے کرنے کے قابل نہ ہوئے؟" گارفیلڈ نے جواب دیا "مجھے پندرہ دن کے لئے آپ امتحاناً مقرر کردیں اگر کام تسلی بخش ہو تو خیر۔ ورنہ میں کام چھوڑ دوں گا"

گارفیلڈ سکول میں داخل ہوا اور چپراسی اور جاروب کش کا کام بھی ساتھ ہی کرنے لگا۔ یہ کہنا اب غیر ضروری ہے کہ سکول کے وقت سے پہلے اور بعد کو وہ بڑھئی کے ہاں کام کرتا تھا۔ کالج کی تعلیم حاصل کرنے کی اُمنگ اس کے دل میں تھی اور وہ اس مقصد کے لئے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہتا تھا۔

گارفیلڈ کا خیال تھا کہ اگر کوئی کام کرنے کے قابل ہے تو وہ اچھی طرح کرنے کے بھی قابل ہے۔ ایک دن ایک ساتھی سے اس کی حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

دوست۔ گارفیلڈ! تم جاروب کشی بھی اسی احتیاط اور صفائی سے کرتے ہو جس احتیاط اور صفائی سے سبق تیار کرتے ہو۔

گارفیلڈ۔ بے شک اور ایسا کیوں نہ کروں؟

دوست۔ بہت سے لوگ ضروری کاموں کو اچھی طرح سے کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ سبق کا تیار کرنا گھنٹی بجانے اور جاروب کشی سے بدرجہا بہتر ہے۔

گارفیلڈ۔ گھنٹی بجانا اپنی جگہ ایسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا سبق یاد کرنا اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے اچھی طرح نہ کیا جائے۔ بہت سے لوگ اس لئے

کامیاب نہیں ہوتے کہ ان میں اپنے کام میں کمال حاصل کرنے کی خواہش نہیں ہوتی میری رائے میں کام کا اچھی طرح سے کرنا بُری طرح کرنے سے زیادہ مشکل نہیں۔ اگر احاطہ صاف نہ ہو تو میری آنکھوں میں یہ ایسے ہی کھٹکتا رہتا ہے جیسے سبق کا تیار نہ کرنا۔

گارفیلڈ کو یہ کام امتحاناً پندرہ دن کے لئے ملے تھے لیکن اس کا کام ایسا تسلی بخش تھا کہ اُسے ان عہدوں پر مستقل طور پر مقرر کیا گیا۔ گارفیلڈ کے وقت سے پہلے یہ کام کمینے کام تھے لیکن اس کے کرنے سے یہ معزز عہدے بن گئے۔ گارفیلڈ نے یہ کام کرتے ہوئے کبھی شرم محسوس نہیں کی۔ وہ ہر ایک کام کو جو دیانت داری سے کیا جائے معزز سمجھتا تھا اور ان کاموں کو تو معزز ہی نہیں بلکہ مقدس خیال کرتا تھا۔ کسی حد تک یہ اس کی تعلیم کے وسائل تھے اور اس کے خیال میں پرماتما نے اس کی جان اس غرض سے بچائی تھی کہ تعلیم حاصل کر کے وہ کوئی نیک کام کر سکے اور زیادہ مفید ہو سکے۔ سکول میں کوئی شخص اس سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ ایک عورت جو ان دنوں سکول میں معلمہ تھی بیان کرتی ہے کہ سارے سکول میں استادوں یا طالب علموں میں کوئی شخص اتنا ہر دلعزیز نہیں تھا جتنا وہ طالب علم جو علاوہ حصول تعلیم کے جاروب کش اور چپراسی کا کام بھی کرتا تھا۔

ایک سال گزرا اور سکول کا جاروب کش سکول میں انگریزی کا ایک استاد مقرر ہو گیا۔ تیسرے سال کے اختتام تک گارفیلڈ تحصیل علم کے علاوہ سکول میں پڑھاتا رہا اور سکول کے وقت سے پہلے اور بعد کو بڑھئی کے ہاں مزدوری بھی کرتا رہا لیکن باوجود ان دقتوں کے چھ سال کی تعلیم اس نے تین سالوں میں ختم کی۔ اس عرصہ میں دوسرے طالب علم اس کی جفاکشی کو دیکھ کر عش عش کرتے تھے۔ ایک طالب علم کی رائے میں کام کرنا اس کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسے معمولی انسانوں کے لئے پانی اور ہوا ضروری ہیں۔ اگر غریبی کی وجہ سے اسے مجبوراً جسمانی محنت نہ کرنی پڑتی تو ایک سال کے اندر ہی اس کا دماغی کام اس کے جسم کو چکنا چور کر دیتا۔ اس کی خوش

قسمتی تھی کہ وہ غریب تھا۔ ایک اُستاد نے پرنسپل سے کہا "گارفیلڈ کی لیاقت اور کام سے مجھے خیال پڑتا ہے کہ وہ دنیا میں ایک طاقت ہوگا" پرنسپل نے کہا "ہاں میرا خود یہی خیال ہے"۔

یہ تین سال کا زمانہ طالب علمی گزرنے والا تھا جب کالج کے منتظموں اور پرنسپل نے صلاح کی کہ گارفیلڈ کی خدمات کالج کی تعلیم کے بعد ہر سکول کے لئے مفید ہوں گی اور انہیں حاصل کرنا چاہیئے۔ منتظم کمیٹی کے ایک ممبر نے پوچھا "اُسے کس عہدے پر رکھوگے؟" پریزیڈنٹ نے کہا "اس کا کچھ مضائقہ نہیں۔ جو کام اس کے سپرد کردوگے وہ اُسی کو قابل تعریف کرے گا۔ اُس کے ایک کام کو دیکھ کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس کام کے عین مناسب ہے لیکن وہ دوسرے کام کو ہاتھ لگاتا ہے اور اس میں بھی اس کی قابلیت دیکھ کر ہم حیران رہ جاتے ہیں" پریزیڈنٹ اور پرنسپل نے گارفیلڈ سے اس بارہ میں بات چیت کی۔ گارفیلڈ کو اپنے سکول سے اُنس تو تھا ہی۔ اس نے مان لیا کہ وہ کالج کی تعلیم ختم کرکے سکول میں اُستاد بنے گا۔

کالج کی تعلیم

گارفیلڈ ولیمز کالج واقع ولیمز ٹاؤن میں داخل ہوا کالج کی تعلیم کے لئے اس نے قرضہ کا انتظام کر لیا تاکہ اس کا سارا وقت تعلیم میں خرچ ہو سکے۔ موسم سرما کی رخصتوں میں اس نے ایک گاؤں میں خوش نویسی کا ایک سکول کھول دیا اور وہاں کے گرجا میں دو چار پُرجوش لکچر دیئے۔ ایک سکول کے منتظموں میں سے ایک نے اس سے کہا "گارفیلڈ! ہائی سکول میں ایک جگہ خالی ہے کام آسان ہے اور تنخواہ معقول ہے۔ اگر تم منظور کرو تو ہم تمہیں ایک سو ڈالر (تین سو روپے) ماہوار تنخواہ دیں گے۔ اگلے ہفتہ سکول کھُلے گا" اس وقت گارفیلڈ اور اس منتظم مسٹر بروکس میں ذیل کی گفتگو ہوئی۔

گارفیلڈ۔ اس آسامی کو قبول کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ میں کالج میں گریجویٹ ہونے کا ارادہ چھوڑ دوں۔

مسٹر بروکس۔ ہاں یہ تو آخر کرنا ہی پڑے گا۔

گارفیلڈ - بی۔ اے پاس کرنا میری زندگی کا مقصد رہا ہے اور میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا کہ میں اس ارادہ کو چھوڑ دوں۔

مسٹر بروکس - خیر۔ یہ تمہارا اختیار ہے۔ تم اپنے نفع و نقصان کو بہتر سمجھتے ہو۔ اگرچہ میری خواہش یہ ہے کہ تم اپنے فائدہ کو سمجھو اور سکول میں کام کرنا شروع کردو۔

گارفیلڈ - ایک اور رکاوٹ بھی ہے۔ میں نے ہرم سکول میں کالج کے لئے تیاری کی ہے۔ اگرچہ کوئی باقاعدہ اقرار نہیں لیکن وہاں کے منتظم امید کرتے ہیں کہ میں کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر ان کا ہاتھ بٹاؤں گا۔ سکول نیا نیا ہے اور زندگی کے لئے جد و جہد کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی اپنی تھوڑی سی طاقت اس کی ترقی کے لئے خرچ کروں۔

مسٹر بروکس - اچھا۔ تو اس میں جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ سوچ لو اور سوچ کر بتا دینا۔

گارفیلڈ - نہیں صاحب۔ میں ابھی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی تجویز میرے لئے بڑی ترغیب ہے۔ میں مقروض ہوں اور آپ کی ملازمت اختیار کرنے سے میرا قرضہ اتر سکتا ہے۔ ہرم میں مجھے اتنی تنخواہ بی۔ اے پاس کر کے بھی نہیں مل سکیگی لیکن میری خواہش ہے کہ میں بی۔ اے پاس کروں۔ میں یہ آسامی قبول نہیں کر سکتا۔ اس وقت جبکہ گارفیلڈ نے تین سو روپے ماہوار کی آسامی کو حصول تعلیم اور سکول کی سیوا کے لئے نامنظور کر دیا۔ اس کی مالی حالت یہ تھی کہ کپڑوں کے ایک جوڑے کی اشد ضرورت تھی لیکن پاس کچھ نہیں تھا۔ جس سے کپڑے بنوا سکے۔ ایک دوست نے کسی درزی سے ذکر کیا۔ درزی نے ایک جوڑا کپڑوں کا سی دیا اور کہا "جب تمہارے پاس قیمت ہوگی۔ دے دینا۔ کوئی میعاد نہیں ہے"

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ کالج میں جماعت میں سب سے اچھا لڑکا۔ سب سے اچھا لکھنے والا اور مباحثہ کرنے والا گارفیلڈ تھا۔

ہرم سکول میں ملازمت

۱۸۵۶ء میں گارفیلڈ نے کالج کی تعلیم ختم کی اور ہرم سکول میں آکر اُستاد مقرر ہوا۔ دو سال کے بعد وہ اس سکول کا پرنسپل مقرر ہوا۔ چار سال پیشتر اس کا کام سکول کا احاطہ صاف کرنا اور گھنٹی بجانا تھا۔ اب تقریباً تین سو لڑکے لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ گارفیلڈ نے اس وقت اپنی تحصیل علم کے شوق کو اور بھی بڑھایا۔ لائبریری کا استعمال اس سے بڑھ کر اور کوئی نہیں کرتا تھا۔ کئی بار وہ دونوں بغلوں میں کتابیں دبائے لائبریری سے نکلتا۔ کئی دفعہ بارش میں وہ کتابیں اُٹھائے ہوئے لائبریری میں چلا جاتا اور ساتھ ساتھ ایک طالب علم چھاتا اس کے سر پر کئے جاتا تھا۔ اس وقت سکول کے لڑکوں کے لئے گارفیلڈ اکثر مختلف مضامین پر لیکچر دیتا تھا جس سے اس کا مقصد ان کی تعلیم کے علاوہ اپنی واقفیت بڑھانا بھی ہوتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ضرورت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ واقفیت کو بڑھائے۔ ایک دفعہ اس نے زندگی کی کایا پلٹ پر لیکچر دیتے ہوئے مفصلہ ذیل الفاظ کہے "ہمارے دارالخلافہ کے عدالتی کمرے کی چھت پر جو قطرے پڑتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو جنوب کی جانب گر جاتے ہیں اور بعض دوسری طرف بہہ جاتے ہیں۔ اس ذرا سے فرق سے پہلے قطرے خلیج مکسیکو میں جا پڑتے ہیں اور دوسرے خلیج لارنس میں۔ ہوا کا چلنا یا ایک پرندوں کے پروں کا پھڑ پھڑانا ان کی قسمت کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کر دیتا ہے۔ میرے نوجوان دوستو! ایسا ہی حال تمہاری زندگیوں کا ہے۔ تم ایک کتاب یا دوست بناتے ہو۔ ایک خیال تمہیں سوجھتا ہے۔ ایک ارادہ تم کرتے ہو۔ یا ایک گھنٹہ ایک خاص قسم کی تمہاری صحبت ہوتی ہے۔ شاید تمہیں یہ باتیں نہایت معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن ممکن ہے کہ ان سے تمہاری زندگی کی کایا پلٹ ہو جائے۔"

اپنے شاگردوں کو گارفیلڈ ہمیشہ تلقین کیا کرتا تھا کہ وقت کے پابند ہوں۔ پست حوصلہ ہونا ان کی نظروں میں انسانیت کا کھونا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ایک طالب علم سے کچھ کام کرنے کو کہا۔ طالب علم نے جواب دیا "میں شاید نہ کر سکوں گا"

گارفیلڈ نے کہا "ہیں شاید کہ نہیں سکوگے؟ میں جب کسی آسامی پر مقرر ہوتا ہوں جس کے فرائض آسانی سے ادا کر سکتا ہوں تو میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس کام کو چھوڑ کر کوئی اور کام کروں جس میں زیادہ کوشش کرنی پڑے ہمیشہ اپنے سامنے اعلیٰ معراج رکھو اور اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہو" گارفیلڈ کا وہی شاگرد لکھتا ہے "جب میں دربان کا کام کرتا تھا کئی دفعہ گارفیلڈ مجھے ٹھہرا لیتا اور بڑے بڑے معاملات میں مجھ سے مشورہ لیتا۔ اب میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس وقت میری رائے کسی وقعت کے قابل نہیں تھی لیکن گارفیلڈ میرے دل میں خودداری کا خیال پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس سے میرے دل میں گارفیلڈ کی عزت اور محبت کئی گنا بڑھ گئی"

۱۸۵۸ء میں جبکہ گارفیلڈ کی عمر ۲۷ سال کی تھی اس نے مسٹر روڈلف سے جو اس کی شاگرد بھی رہ چکی تھی شادی کی۔ مس روڈلف کی عمر اس وقت ۲۶ سال کی تھی۔

پولیٹکل زندگی اور انجام

یہ ناممکن تھا کہ گارفیلڈ کی لیاقت کا آدمی صاحب تقریر بھی ہو اور ملک کی پولیٹیکل زندگی میں حصہ نہ لے۔ اس کے دوستوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ پولیٹکل معاملات میں دلچسپی لے لیکن وہ یہی کہتا رہا کہ سکول کی سیوا کرنا اس کا فرض ہے اور اسی میں اسے راحت ہے۔ دوستوں کے اصرار پر اور کمیٹی کی رضامندی سے اس نے اپنی زندگی کو پولیٹیکل کام میں لگانا منظور کیا۔ اس وقت شمالی اور جنوبی ریاستوں میں تنازعے شروع ہو گئے تھے۔ جنوبی ریاستیں خود غرضی کی وجہ سے غلامی کی حمایت میں تھیں اور شمالی ریاستیں غلامی کو دور کرنا چاہتی تھیں۔ گارفیلڈ طالب علمی کے زمانہ سے غلامی کے برخلاف تھا۔ اس نے میدان جنگ میں کئی عہدوں پر کام کیا۔ ان میں سے ایک جرنیل کا عہدہ تھا۔

۱۸۸۰ء میں ریاست ہائے متحدہ کی اعلیٰ کونسل کا ایک ممبر چنا جاتا تھا۔ گارفیلڈ کے دوستوں نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ تم کو اس عہدہ کے لئے منتخب کریں" گارفیلڈ نے

کہا" اچھا۔ اگر تمہاری رائے میں میں اس طرح زیادہ مفید ہو سکتا ہوں تو مجھے کچھ اعتراض نہیں" انہوں نے کہا" کونسل میں انتخاب ہوگا۔ بہتر ہے تم وہاں چلے جاؤ" گارفیلڈ نے کہا" یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ تم جو چاہو کرو۔ خود میں کونسل کا ممبر بننے کے لئے چھوٹی انگلی بھی ہلانا نہیں چاہتا۔ ساری زندگی میں میں نے فقط ایک عہدہ کے لئے کوشش کی ہے اور وہ ہرم سکول کے چپراسی کا عہدہ تھا۔ اگر لوگ مجھے چاہتے ہیں تو وہ خود چن لیں گے" کونسل میں جانے سے اس نے انکار کر دیا۔ جب دوسرے امیدواروں نے دیکھا کہ لوگ گارفیلڈ پر کتنے مست ہیں تو انہوں نے اپنے نام واپس لے لئے اور گارفیلڈ اتفاق رائے سے چنا گیا۔ اس کے بعد وہ کونسل میں گیا اور وہاں جا کر ایک تقریر کی جس کا آخری حصہ دیواروں پر آبِ زر سے لکھنے کے قابل نہیں بلکہ دلوں پر نقش کرنے کے قابل ہے اس نے کہا۔

" بیس سال سے میری زندگی پبلک زندگی رہی ہے اور اس میں تقریباً اٹھارہ سال میں اضلاع متحدہ کی کانگرس میں رہا ہوں۔ اس تمام عرصہ میں ایک بات میرے مدِ نظر رہی ہے۔ میری رائے ٹھیک تھی یا میرا خیال تھا مگر میں ہمیشہ یہ چاہتا رہا ہوں کہ اپنے عقاید کے مطابق عمل کروں۔ خواہ اس میں مجھے کتنی ہی دقت ہو۔ میں بہت عرصہ تک کانگریس میں ایک ضلع کا وکیل رہا ہوں اور میری خواہش رہی ہے کہ میرا طریق عمل اس ضلع کے حسب پسند ہو لیکن اس سے بڑھ کر میری خواہش رہتی ہے کہ میرا طریق عمل ایک خاص شخص کے حسب پسند ہو۔ اس شخص کا نام گارفیلڈ ہے فقط وہی ایک ایسا آدمی ہے جس کے ساتھ ہی مجھے مرنا پڑے گا۔ اگر وہ شخص بھی مجھ سے ناخوش ہو تو میری صحبت تسلی بخش نہیں ہو سکتی۔"

ابھی پانچ ماہ ہی گزرے تھے کہ پریزیڈنٹ کے انتخاب کی ضرورت ہوئی۔ گارفیلڈ پریزیڈنٹ منتخب ہوا۔ جس وقت گارفیلڈ نے عہدہ کا چارج لیا۔ اس وقت اس کی بڑھیا ماں جس نے جنگل میں اسے مصیبتوں میں پالا تھا اس کا اقبال دیکھنے کے لئے زندہ تھی اور وہاں موجود تھی۔

کہتے ہیں کہ جس شخص کے دشمن نہیں ہوتے۔ اس کے دوست بھی نہیں ہو سکتے گارفیلڈ جیسے مضبوط رائے کے آدمی کے لئے ناممکن تھا کہ سارے لوگ اُس کے حق میں ہوں۔ ابھی پریزیڈنٹ بنے ہوئے اسے چار مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ ریلوے سٹیشن پر ایک بیکار وکیل گیٹو نامی نے اس کے دو گولیاں پستول سے ماریں یہ صدمہ مہلک ثابت ہوا۔

سوامی دیانند سرسوتی

(از لالہ دیوان چند جی ایم۔ اے)

ہر چیز سے موت گو بلی ہے
پر دھرم نے وہ بھی جیت لی ہے

مختصر حالات زندگی

گجرات کاٹھیا واڑ کی ایک چھوٹی سی ریاست موروی میں ۱۸۲۴ء میں ایک برہمن پنڈت امبا شنکر کے گھر ایک بالک پیدا ہوا۔ اس کا نام مول شنکر رکھا گیا۔ جیسا براہمن گھرانوں میں رواج ہوتا ہے پانچ چھ برس کی عمر میں مول شنکر کی معمولی تعلیم گھر میں شروع کی گئی اور آٹھ برس کی عمر میں جنیو دے کر سندھیا گایتری سکھائی گئی۔ پنڈت امبا شنکر جو راج کی طرف سے ایک اچھی آسامی پر مقرر تھے شیو مت کے پیرو تھے۔ ان کا گزارا لوگوں کے دان پر تھا تاہم ان کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا لڑکا شیو مت کے سنسکار مول شنکر پر ڈالنے کی کوشش کی اور شیو کی مورتی کی پوجا کی ہدایت کرتے رہے۔ پانچ چھ سال اسی طرح گزر گئے۔ نہ تو پنڈت امبا شنکر کو اور نہ ان کے رشتہ داروں اور دوستوں میں سے ہی

کسی کو خیال آیا کہ لڑکے مول شنکر کے جسم میں ایک خاص قسم کی آتما تھی۔ جب مول شنکر چودہ برس کا ہوا اُسے یجروید مول زبانی یاد ہو گیا اور قواعد کی کچھ کتابیں بھی اُس نے پڑھ لیں۔ اسی سال شوراتری کا برت رکھنے کا باپ نے اُسے حکم دیا مول شنکر کی ماں نے اس چھوٹی عمر میں اس برت رکھنے کو اس کی صحت کے لئے نقصان دہ خیال کیا لیکن پنڈت امبا شنکر کے اصرار پر مول شنکر نے برت رکھا اور سارا دن فاقہ میں گزارا۔ رات کو شیو کے مندر میں جو گاؤں سے باہر تھا پوجا کرنے والے گئے۔ ان میں ایک پنڈت امبا شنکر تھے جو اپنے لڑکے کو ساتھ لے گئے شیو جی سے ور پانے کے لئے ضروری تھا کہ پجاری رات بھر جاگتے رہیں۔ مول شنکر کو تاکید کی گئی کہ تکلیف اُٹھا کر بھی رات بھر جاگتا رہے۔ جب تھوڑی رات گزری تو پنڈت امبا شنکر اونگھنے لگے اور آہستہ آہستہ سب پوجا کرنے والے سونے لگے۔ مول شنکر اکیلا جاگتا رہ گیا۔ اُسے بھی نیند نے آگھیرا مگر پہلی دفعہ اُس نے برت رکھا تھا۔ جاگنے کی باپ نے تاکید کی تھی اور برت اور جاگنے کے مہاتم جو باپ نے اُسے سنائے تھے وہ اُسے ابھی بھولے نہیں تھے۔ مول شنکر نے مُنہ پر ہاتھ پھیرا آنکھوں پر چھینٹے دیئے اور نیند کو غالب نہ آنے دیا۔

اس شیوراتری کو اس بڑے مذہبی انقلاب کی بنیاد رکھی گئی جو بعد کو سوامی دیانند کی ذات سے ظہور میں آنا تھا۔ اس رات کو جاگنے کے لئے انہیں وہ ور دیا گیا جس کے لئے مہا پرش ترستے ہیں۔ ایک گرتی ہوئی قوم کو سنبھالنے۔ چھپے ہوئے ویدک دھرم کو دنیا کے سامنے لانے، مُردہ ہڈیوں میں جان ڈالنے۔ بے کسوں کی رکھشا کرنے، ست کا پرکاش اور است اور پاکھنڈ کا ناش کرنے کا کام مول شنکر کو اس رات دیا گیا اور پھر اس نے اپنی ساری طاقت اس کام کے پورا کرنے میں خرچ کی۔ جب مندر میں لوگوں کا شور نہ رہا تو ایک چوہا بل سے نکلا اور مورتی کے اردگرد پھرنے لگا اور اس سامگری کو جو شیو کی مورتی پر رکھی تھی کھانے لگا۔ کبھی چوہا مورتی پر ایک طرف دوڑتا۔ کبھی دوسری طرف دوڑتا۔ مول شنکر کے دل میں

سوال پیدا ہوا "کیا یہی مورتی جو اپنے اوپر سے ایک ناچیز چوہے کو نہیں ہٹا سکتی وہ مہا دیو ہے جس کی طاقت کے متعلق اتنی کتھائیں سنائی جاتی ہیں؟ کیا یہی وہ مہا دیو ہے جو ساری دنیا کا مالک ہے اور جس کی پوجا کرنا ہمارا دھرم ہے؟" ان سوالوں سے بالک بہت گھبرایا۔ اس گھبراہٹ میں اس نے بعض پجاریوں اور اپنے باپ کو اٹھانے کی کوشش کی کہ ان سے اس کا جواب پوچھے مگر وہ خراٹے لے رہے تھے۔ کروٹ بدل کر پھر سو گئے اور مول شنکر اکیلا پھر اپنے خیال میں غرق ہو گیا۔ اس کے دل میں ست کا پرکاش ہوا اور فوراً اُس کے مُنہ سے نکلا "یہ مورتی مہادیو نہیں۔ یہ پرماتما نہیں ہو سکتی اور اس کی پوجا کرنا بڑا پاپ ہے ہم پرماتما کو بھول گئے ہیں"۔ اس واقعہ کے دو سال بعد مول شنکر کی چھوٹی بہن جسے وہ پیار کرتا تھا ہیضہ سے مر گئی۔ مول شنکر کو اس سے صدمہ پہنچا۔ دوسرے رشتہ داروں کی طرح رونے دھونے میں مصروف ہونے کی جگہ مول شنکر سوچنے لگا کہ موت کیا ہے اور اس سے کیونکر بچ سکتے ہیں؟ یہ سوال صدیوں کے بعد اپنے پورے زور سے ایک ہندوستانی بچے کے دل میں پیدا ہوا۔ تین سال اور گزر گئے اور مول شنکر کا پیارا چچا بھی گزر گیا مول شنکر کو پھر اسی سوال نے آ گھیرا۔ اُسے بتایا گیا کہ یوگ سے موت کو جیت سکتے ہیں۔ مول شنکر کے دل پر بیراگ نے اثر کیا۔ پنڈت امبا شنکر نے اسے گرہست میں جکڑنے کی صلاح کی۔ مول شنکر گھر سے نکل گیا مگر باپ نے آ پکڑا۔ پھر مول شنکر گھر سے نکل پڑا اور اب کی بار پنڈت امبا شنکر اور ان کے رشتہ دار اُسے ڈھونڈ کر لانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مول شنکر برہمچاری بنا اور ودیا حاصل کرتا رہا۔ پھر سنیاسی بنا اور دیانند سرسوتی کا نام اُسے دیا گیا۔ دیانند سرسوتی متھرا میں اندھے سوامی ورجانند کے پاس پہنچے جن کی جائے پیدائش ہونے کا فخر پنجاب کو ہے۔

سوامی ورجا پورانوں کے سخت مخالف تھے اور آرش گرنتھوں کو ہی اپنا دھرم کی کتابیں سمجھتے تھے۔ سوامی دیانند ڈھائی سال ان کے پاس پڑھتے رہے۔ اس زمانہ

طالب علمی کے اختتام پر بھینٹ دینے کا وقت آیا تو بولے "میرے پاس تو کچھ ہے نہیں جو آپ کی سیوا میں پیش کر دوں" سوامی ورجانند نے کہا "بس تم سے وہی مانگتا ہوں جو تمہارے پاس ہے جاؤ اپنا لکھا پڑھا سپھل کرو۔ آریہ ورت اگیان اودیا اور پاپ سے پیڑت ہے۔ ویدوں کی تعلیم ملک میں پھیلاؤ۔ ست شاستروں کا پرچار کرو۔ اگیان کو دور کرو اور ایک پرماتما کی پوجا لوگوں کو سکھاؤ۔ پتھروں کو پکڑ کر سچے ایشور کو اور انسانوں کے بنائے قصوں کو لے کر ویدوں کو لوگوں نے چھوڑ دیا ہے۔ لوگوں کو سیدھے رستہ پر ڈالو۔ ایسا نہ ہو کہ جیب اور دنیا بڑھ رہی ہے۔ رشی۔ سنتان اور نیچے گرتی جائے۔ اندھا ورجانند اور کچھ نہیں چاہتا۔ یہی تمہاری دکھشنا اور یہی تمہاری بھینٹ ہے"

سوامی دیانند کی خوش قسمتی تھی کہ جو کام پرماتما نے انہیں چودہ برس کی عمر میں شوراتری کی مبارک رات کو سونپا تھا اور جس کے قابل ہونے کے لئے وہ کوشش کر رہے تھے وہی کام اب ۳۹ برس کی عمر میں آخری گورو سوامی ورجانند کی طرف سے انہیں سونپا گیا۔ اسی کام کو کرنے کے لئے انہوں نے گھر بار چھوڑا تھا۔ اسی کام کے لئے انہوں نے باپ۔ ماں اور رشتہ داروں کی محبت اور دنیا دی آرام پر مصیبتوں کی زندگی کو ترجیح دی تھی۔ دشوار گزار جنگلوں اور میدانوں کی تکلیفوں کو انہوں نے راحت سمجھا۔ سوامی ورجانند سے کئی بار سخت الفاظ سنے۔ جب انہوں نے اپنے ارد گرد دیکھا تو محسوس کیا کہ ایک اینٹ نہیں دو نہیں بلکہ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ جسمانی لحاظ سے ہندو کمزور تھے۔ جہالت کا راج ان میں تھا۔ ان میں دہارمک زندگی برائے نام تھی۔ پرماتما کی پوجا کی جگہ بے جان چیزوں کی پرستش اور توہمات پر یقین ان کا دھرم بن چکا تھا۔ ایسی مشکلات کا سامنا کرنا تھا اور کام کرنے والا اکیلا نادار سادھو تھا لیکن سوامی دیانند نے ارادہ کیا کہ خواہ کچھ ہی ہو سوامی ورجا کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ زندگی کی قیمت اسی حالت میں ہے جب ایک اعلیٰ معراج کو پہنچنے کی کوشش کی جائے اور اس کوشش میں کسی تکلیف کی پرواہ نہ کی جائے۔

سوامی دیانندنے اب شہر بہ شہر اپدیش کرنا شروع کیا۔ ان کے کام کا مفصل حال لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس کام کا نتیجہ آریہ سماج اور ملک کی موجودہ مذہبی اور سوشل ہل چل ہے۔ ۱۸۸۳ء میں جبکہ وہ ریاست جودھ پور میں پرچار کر رہے تھے انہیں زہر دیا گیا اور اسی سال ۳۰۔ اکتوبر دیوالی کی شام کو جبکہ کروڑوں چھوٹے چھوٹے چراغ ہندوؤں کے گھروں کو روشن کر رہے تھے ہندوستان کا سورج غروب ہو گیا۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے "پرماتما تیری اچھیا پورن ہو"

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

سوامی دیانند کا کیرکٹر

سوامی دیانندان آدمیوں میں سے تھے جو ملکوں کی تواریخ بناتے ہیں۔ پچھلے دس بارہ سال سے میں ان کی شخصیت اور کیرکٹر کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہوں اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ بہت کم ہے اور اس میں سے فقط دو تین باتیں یہاں بیان کی جاسکتی ہیں۔ سوامی دیانندنے تحقیق حق کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا۔ اسی لئے وہ گھر سے باہر نکلے تھے۔ اسی لئے وہ دشوار گزار راستوں کی خاک چھانتے برسوں جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرتے رہے۔ انہوں نے معلوم کیا کہ وید پرماتما کا گیان ہیں اور ویدوں میں ایک پرماتما کی پرستش کی تعلیم ہے۔ ساری عمر وہ ویدک تعلیم کا پرچار کرتے رہے۔ مورتی پوجا کے خلاف ہونے کی وجہ سے انہوں نے برہمنوں کو اپنے خلاف کر لیا۔ کوئی انہیں ناستک کہتا۔ کوئی پادریوں کا ایجنٹ بتاتا لیکن وہ ہمیشہ اپنے کام میں لگے رہے۔ لاہور میں ان سے کہا گیا کہ اگر وہ مورتی پوجا کے خلاف کہنا چھوڑ دیں تو مہاراجہ کشمیر ان سے راضی ہو جائیں گے۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ انہیں پرماتما کی رضا کی ضرورت ہے۔ بعض لیکچروں میں عیسائی مذہب پر چوٹیں کرتے تھے۔ عیسائی پادری ہندوؤں کے مذہب کی توہین کرتے تھے لیکن ایک آریہ سے عیسائی مذہب کے برخلاف سننا ان کے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔

ایک موقعہ پر سوامی جی سے کہا گیا کہ وہ سخت کلامی سے کام نہ لیا کریں کیونکہ اس سے بعض انگریز حکام ناراض ہو جاتے ہیں۔ سوامی جی نے کہا "لوگ کہتے ہیں سچائی کا اظہار نہ کرو۔ کلکٹر ناراض ہو گا۔ کمشنر ناخوش ہو جائے گا۔ گورنر سزا دے گا۔ ارے شاہنشاہ عالم بھی کیوں نہ ناراض ہو جائے ہم تو ستیہ ہی کہیں گے۔ یہ جسم فانی ہے۔ اس کی حفاظت میں دھرم کی پرواہ نہ کرنا عقلمندی نہیں۔ اس جسم کو جب انسان کا جی چاہے ناش کر دے لیکن مجھے وہ جوانمرد بتاؤ جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ میرے آتما کا ناش کر سکتا ہے۔ جب تک ایسا جوانمرد دنیا میں دکھائی نہیں دیتا میں یہ سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں کہ آیا میں سچائی کو دباؤں گا یا نہیں"۔

پرشیا کے فریڈرک اعظم کے متعلق روایت ہے کہ ایک دن جب وہ بازار میں گزر رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کا ایک گروہ ایک اشتہار کو جو اونچا دیوار پر لگا تھا بغور پڑھتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ اشتہار اس کے خلاف ہے۔ اس نے وہ اشتہار اتروا کر نیچے لگوا دیا تاکہ لوگ آسانی سے پڑھ سکیں۔ فریڈرک سے کسی نے کہا "آپ نے یہ کیا کیا؟ اس اشتہار کو تلف کر دینا چاہیئے تھا" فریڈرک نے جواب دیا "میرے اور میرے لوگوں کے درمیان ایک قسم کی سمجھوتی ہو گئی ہے وہ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ میں جو چاہتا ہوں وہی کروں گا"۔ اپنے اہل وطن کے متعلق سوامی دیانند کا یہی خیال اور طرز عمل تھا۔

سوامی دیانند ہمیشہ نڈر رہے اور کبھی بیرونی دباؤ کی وجہ سے انہوں نے اپنے خیالات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ ریاست جودھ پور میں تھے تو وہاں آپ نے دیکھا کہ مہاراجہ صاحب ریاست کے کام کی طرف توجہ کرنے کی جگہ اپنا وقت ایک بازاری عورت ننھی کی ناز برداریوں میں گزارتے ہیں۔ ایک دن سوامی جی مہاراجہ صاحب کے پاس گئے اس وقت ننھی وہاں تھی۔ سوامی جی کو دور سے دیکھ کر مہاراجہ صاحب نے اشارہ کیا کہ ننھی کو وہاں سے پالکی میں اٹھا کر لے جائیں پالکی ایک طرف جھک گئی۔ مہاراجہ صاحب نے ہاتھ لگایا۔ سوامی جی نے یہ دیکھا۔ آگ بگولا

ہو گئے اور سب کے سامنے مہاراجہ صاحب کو خوب ڈانٹا اور کہا "اگر شیروں کی گود میں کتیا بیٹھے تو ایسے سماگم سے کیا اولاد ہو گی"؟ لوگ اس بیباکانہ تقریر سے گھبرا گئے۔ مہاراجہ صاحب پر تو جو اثر ہوا سو ہوا لیکن ننھی اسی دن سے سوامی جی کی دشمن جان بن گئی۔ اس کی استدعا پر وہاں انہیں زہر دیا گیا اور یہی ان کی موت کا سبب ہوا۔

سوامی جی گورو ڈم کے سخت مخالف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جہاں لوگ دوسروں کو مرید بنا کر ان کی ذہنی اور روحانی آزادی چھین لیتے ہیں وہاں حق پرستی نہیں آسکتی اور قومی ترقی امر محال ہے اس لئے وہ کل جگی گوروؤں اور پیروں کے خلاف ہمیشہ بولتے تھے کبھی دفعہ انہیں لالچ بھی دیئے گئے لیکن وہ ان ترغیبوں میں نہ پھنسے۔ جب وہ لاہور میں قیام رکھتے تھے تو ایک دفعہ آریہ سماج کی انترنگ سبھا میں کوئی معاملہ پیش ہوا۔ سوامی جی سے رائے مانگی گئی تو انہوں نے کہا "میں اس سبھا کا ممبر نہیں۔ میرا کیا حق ہے کہ رائے دوں"؟ ایک دن ان سے کہا گیا کہ وہ سماج کے سرپرست اور گورو بننا منظور کریں۔ انہوں نے کہا "مجھے گورو بنا لوگے تو پرماتما کو کیا بناؤ گے؟ ہمارا سب کا گورو پرماتما ہے"۔

سوامی دیانند کے متعلق عام شکایت کی جاتی ہے کہ انہوں نے ہندو قوم کو ایک کرنے کی جگہ اس میں اور تفریق بڑھا دی۔ ان کا طرز کلام سخت تھا۔ بھگتی کے اپدیش وہ کم کرتے تھے اور بحث مباحثوں میں مصروف رہتے تھے۔ ایسی شکائتیں سنتے ہوئے ہمیں خیال رکھنا چاہیئے کہ سوامی دیانند کو کن حالات میں کام کرنا پڑا۔ ہندو قوم کی حالت ایک بیمار کی حالت تھی جس کے جسم میں بہت سا فاسد مادہ بھرا ہوتا ہے۔ سوامی دیانند نے جراح کا کام کیا اور یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ بیمار چلائے اور اپنے محسن کو برے بھلے ناموں سے یاد کرے اور اس پر کئی قسم کے الزام لگائے۔ ایک دفعہ جالندھر میں سوامی جی سے کہا گیا کہ وہ دوسرے مذاہب کی نکتہ چینی کے بجائے بھگتی کا پرچار کیا کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "صاف سڑکیں اور ان پر شہادوں نے پھولوں کی کیاریاں خوشنما نظر آتی

ہیں لیکن یاد رکھو پیشتر اس کے کہ یہ سب کچھ بن سکے بارود کے ذریعہ پہاڑیوں کو اڑانا ضروری ہوتا ہے اور یہ کام چنداں خوش نما نہیں ہوتا۔ میرا کام اس وقت رستہ صاف کرنا ہے۔ جب رستہ صاف ہو گیا تو کیاریاں بھی لگ جائیں گی۔ پہلے لوگوں کو بھگتی کے اپدیش سننے کے قابل تو بنا لے دو۔ اس کے بعد ایسے اپدیش کر دوں گا۔"

مہاتما ٹالسٹائی

ایک صدی ہوئی مملکت روس کے دو زبردست جنگلی اور زراعتی خطوں کے درمیاں جہاں سے اس وقت اور شاید اب بھی بیسیوں میل تک کسی شہر کا نام و نشان نہیں ہے اور نہ آمد و رفت کے لئے آسانیاں اور سہولتیں موجود ہیں۔ ایک پرانے طرز کے بنے ہوئے مکان میں ایک ایسے بچہ کی پیدائش ہوئی جس نے اپنی زندگی کے عمل اور زبردست تحریروں کے ذریعے سے ساری دنیا کی ہیئت کو بدل دیا۔ جس کے پُرزور خیالوں نے دنیا کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے طرز معاشرت کو بدل ڈالے اور تہذیب کا نیا معیار سامنے رکھے۔ کس کو اُمید تھی کہ دنیا کا اتنا بڑا رہبر ایسے لق و دق بیاباں میں پیدا ہوگا۔ کسی نجومی نے اس کی پیدائش اور زندگی کے متعلق کوئی پیشین گوئی نہ کی۔ نہ مشرق نہ مغرب ہی سے عقل مند لوگ اُس کو سجدہ کرنے آئے اور نہ ہی اس کی پیدائش کے وقت کوئی ستارہ یا معجزہ ظہور میں آیا۔ اُس کی پیدائش میں اس کے ماں باپ کو کوئی خاص خوشی حاصل نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کا چوتھا لڑکا تھا اور حالانکہ خاندان معزز تھا مگر اُس وقت اُس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ بچہ کوئی خوب صورت بھی نہ تھا۔ اگر ٹالسٹائی کی صورت۔ شباہت وجسامت کا سچا اندازہ کرنا ہو تو ایک ایسا بچہ اپنے خیال میں پیدا کر لیجئے کہ جس کا بدن فربہ۔ چہرہ بدنما۔ ہونٹ موٹے۔ آنکھیں چھوٹی۔ بھوری اور

وضع قطع معمولی کسانوں کے بچوں کی سی ہو۔ بچہ کو خود بھی اپنی بدشکلی کا احساس تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "میں بخوبی جانتا تھا کہ میں سادہ اور بدشکل ہوں۔ لہذا جب کبھی شکل و شباہت کا ذکر کوئی کیا کرتا تھا تو مجھ کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ لہا اوقات مجھ کو مایوسی ہو جایا کرتی تھی اور میں سوچا کرتا تھا کہ ایسے انسان کے لئے جس کی ناک چوڑی۔ ہونٹ موٹے اور آنکھیں چھوٹی ہوں۔ دنیا میں کوئی خوشی نہیں ہو سکتی"۔

ایک ایسا شخص جو خود اپنی آئندہ زندگی میں یتیموں کا سہارا۔ غریبوں کا مددگار۔ مظلوموں کا حامی بننے والا تھا۔ اُس کو بھی اپنا بچپن یتیمی میں کاٹنا پڑا۔ اُس نے نہ جانا کہ ماں کی محبت کیا شے ہے کیونکہ پیاری ماں اُس کی پیدائش کے ایک سال ہی کے اندر راہیٔ مُلک عدم ہو گئی۔ اُس نے نہ جانا کہ سایہ پدری کیا چیز ہے کیونکہ اس کا پیارا باپ سات سال کی عمر میں اُس کو یتیم بنا گیا۔ ایک چچی نے اُس بچہ کی غور و پرداخت اپنے ذمہ لی۔ یہ چچی ایک پکے "مذہبی خیال کی عورت تھی اور معصوم بچہ کی زندگی پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑا مگر تین سال کے عرصہ میں اس چچی کا بھی انتقال ہو گیا اور ایک دوسری چچی نے یہ فرض اپنے ذمہ لیا جہاں پہلی چچی کی زندگی کا ٹالسٹائی پر یہ اثر ہوا کہ مذہبی خیالات اور جوش و خروش اُس کی زندگی کے جوہر بن گئے۔ جو پچاس سال کی رگڑ کے بعد کھلے۔ دوسری چچی کی زندگی نے ٹالسٹائی کو محبت کا آموختہ پڑھایا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ محبت کیا شے ہے اور صلح اور خاموشی کی زندگی کے فوائد کیا ہیں؟ ایک نے اپنی زندگی کے معصوم بچہ کے دل میں اُس بیج کو بویا جو پچاس برس بعد کنول کی شکل میں نمودار ہوا۔ دوسری چچی نے اُس کی زندگی کے لئے پانی مہیا کیا۔

جہاں بچہ نے ایام طفلی میں کسی خاص ہونہاری کی امید نہ دلائی وہاں ایام طالب علمی میں بھی اس نے کسی علمی قابلیت کا اظہار نہ کیا۔ اس کی تعلیم اعلیٰ طبقہ کے بچوں کی طرح عمل میں آئی۔ مکان پر اُس کے پڑھانے کے لئے جرمن اور فرانسیسی اُستاد مقرر کئے گئے۔ قازان کی یونیورسٹی سے میٹریکولیشن امتحان پاس کیا اور چونکہ رجحان طبع اوّل ہی سے مشرقی تہذیب کی طرف تھا۔ لہذا اس نے مشرقی زبانیں پڑھنی شروع کیں مگر

امتحان میں مایوسی نصیب ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد عربی اور ترکی زبانیں سیکھنی چاہیں مگر یہ اس کے چنچل دل و دماغ کو زیادہ عرصہ کے لئے اپنی گرفت میں نہ رکھ سکیں۔ ان سب تجربات سے تھک کر قانون کی طرف توجہ کی مگر اس میں بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ قانون سے گھبرا کر تواریخ اور مذہب کا سہارا لیا مگر نتیجہ یہ نکلا کہ جس کا دامن پکڑا تھا اسی کو چاک کرنا شروع کیا۔ یعنی مذہبی تعلیم نے ٹالسٹائی کو لامذہب بنا دیا اور تواریخ کے پڑھنے نے یہ خیالات پیدا کر دیئے کہ جو واقعات ہزار سال ہوئے گزر چکے اُن کی معلومات سے کیا فائدہ ہے مگر اتنی بے التفاتی پر بھی کم از کم ان میں کامیابی تو حاصل ہوئی

قازان میں جہاں ٹالسٹائی تواریخ اور مذہب کی تعلیم حاصل کر رہا تھا وہاں اپنی شبانہ روز کی عملی زندگی میں دنیا کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اعلیٰ قسم کا لباس پہننا۔ بدچلن عورتوں کی صحبت میں رہنا۔ شراب خوری اور قمار بازی کے عیبوں میں وہ کون سا عیب تھا جو اس نیک اور خدا ترس بزرگ سے بچا ہو۔ کیا ٹالسٹائی کی زندگی اس عقیدہ کا ثبوت پیش نہیں کرتی کہ اونچے درجے کے سنت ہونے کے لئے یہ لازمی ہے کہ انسان ایک بڑا گنہگار بھی ہو؟

عیاشی اور شراب خوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ تندرستی بگڑ گئی اور کچھ مدت اپنے دیہات میں رہ کر کسانوں کی بہبودی کی سعی میں گزاری مگر کامیابی کی صورت نہ دیکھ کر مایوسی ہو گئی اور دارالخلافہ روس میں بود و باش اختیار کی۔ کچھ عرصہ تک شہر کی ظاہرا خوبیوں نے ٹالسٹائی کو اس کا مفتوں بنا دیا اور اس نے اس بات کا عزم کیا کہ شہر میں رہ کر وہ چست اور محنتی بنے گا اور ایک عالم باعمل کی کارآمد زندگی بسر کرنے لگا مگر اس زندغانہ خراب پر یہ زہد کی قلعی زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد ہم اس پرانے توبہ شکن مست کے ہاتھ میں پھوٹی ہوئی ایک بوتل اور ٹوٹا ہوا ایک پیمانہ دیکھتے ہیں اور شان یہ تھی کہ ٹکے ٹکے کی محتاج تھی اور قرض کی مے پیتے تھے مگر اس بیہوشی کی حالت میں بھی ٹالسٹائی مسیح کے پہاڑی وعظ ڈیوڈ کا پریسیلڈ ٹیمپر بانورویلی جنیریس

Toeppers norvelli generovaress

اور روسو کی تصنیفات کا مطالعہ

کیا کرتا تھا۔ دراصل ابتدا عمر ہی سے ٹالسٹائی کے اندر بہترین شخص بننے کا مادہ قدرتی طور سے موجود تھا اور اس کی طبع کا رجحان گناہ کی طرف نہ تھا مگر ادھر تو جسم ایسا پایا تھا کہ اس کی نفسانی ضروریات معمولی آدمیوں سے کہیں زیادہ تھیں اُدھر کم عمری میں ہی ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور بھائیوں کی زندگی کا بھی اثر ان کے معنوں میں بہتر ثابت نہ ہوا۔ سوسائٹی کی حالت یہ تھی کہ وہ بڑی سے بڑی ہستی کو بھی نیچے کی طرف کھینچ لے جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ ٹالسٹائی لکھتا ہے "میری پیاری چچی جس کے ساتھ میں دارالخلافہ میں رہا کرتا تھا گو حد درجہ کی پاک اور نیک خاتون تھی مگر اس کی دلی خواہش تھی کہ میرا ناجائز تعلق کسی بیاہی ہوئی عورت سے ہو جائے۔"

گنہگار ٹالسٹائی کے اندر روحانیت کا عنصر موجود تھا اور یہ کسی گنہگار میں نہیں ہوتا اس کی طبیعت ایسی بوالہوسی کی زندگی سے سیر ہو گئی اور اس نے دارالخلافہ کی بود و باش ترک کر دی۔ بڑا بھائی کوہ قاف کے صوبہ میں فوجی ملازمت میں تھا ٹالسٹائی بھی وہاں چلا گیا۔ ٹالسٹائی عاشق نہ تھا حسن پرست تھا کوہ قاف کی خوب صورتیاں، وہاں کی سرسبز اور شاداب گھاٹیاں، باشندوں کی آزادانہ زندگی۔ ان کی کثرت شراب خوری اور عورتوں کا حسن اس کو کچھ ایسا بھایا کہ ٹالسٹائی نے اپنی بقیہ عمر یہیں کاٹنے کا تہیہ کر لیا اس کو ضرورت بھی کس چیز کی تھی۔ سرسبز پہاڑ کے اوپر ایک جھونپڑی۔ دو وقت پیٹ بھر کر گوشت روٹی۔ شراب اور کسی حسین نازنین کا پہلو مگر جہاں ٹالسٹائی اس عیش اور آرام طلبی کے خواب دیکھ رہا تھا وہاں اس کا ضمیر یہ بھی کہتا تھا کہ میں کوئی اچھا شخص اور بڑا کام کرنے کے لئے قابل ہوں۔ میں معمولی انسانوں کی طرح دن کاٹنے کو پیدا نہیں ہوا۔

ٹفلس میں فوجی امتحان پاس کیا اور ملازمت میں داخل ہو گیا مظلوموں پر ظلم کر کے مقتولوں کو قتل کر کے باغیوں پر ستم ڈھا کر ٹالسٹائی نے مظلوموں اور باغیوں سے ہمدردی کا مادہ پیدا کیا۔ اس زمانہ میں ہم ٹالسٹائی کو ایک ایسی مہم میں شامل پاتے ہیں جو سرکیشین کی بغاوت فرو کرنے میں درپیش ہے اور جو جنگ و جدل کا دشمن اور صلح کا حامی ہوگا اس زمانہ میں ٹالسٹائی تلوار لئے ہوئے کشت و خون کرنے میں معروف ہے مگر یہ خونی جوش و خروش

زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا اور وہ مہم سے گھر کو واپس ہوا۔ اُسی زمانے میں اس نے پہلی تصنیف "بچپن" لکھی جو اُس زمانے کے سب سے بہترین روسی رسالہ میں بلا معاوضہ چھپی کیا لیو ٹالسٹائی کو ایک مہم میں جنگ کے کافی تلخ تجربات حاصل ہو چکے تھے؟ کیا چھوٹی سی مہم کے نظارہ نے اس کے دل میں جنگ و جدل کی طرف سے دائمی نفرت پیدا کر دی تھی؟ نہیں ابھی ٹالسٹائی کو کچھ اور تلخ تجربات حاصل کرنے تھے۔ جنگ کریمیا چھڑنے کی دیر نہ ہوئی کہ ٹالسٹائی نے اپنے آپ کو فوجی ملازمت کے لئے پیش کر دیا اور اس کو شہزادہ گاشیکو (Goshekow) کی حملہ آور فوج میں تعینات کیا گیا۔

اس خونریز لڑائی میں اُس نے کیا کچھ نہیں دیکھا قوم کا جوش و خروش اور بے چینی رہنمایان قوم کی پُرزور تقریریں۔ جنگ کی تیاریاں۔ فوجوں کی ترتیب۔ سامان حرب و ضرب کا اکٹھا کرنا۔ رسد کی فراہمی۔ باربرداری کا انتظام۔ جنگ کی تیزی۔ شدت حملہ کا غیظ و غضب شکست کی مایوسی۔ سپاہ کا درہم برہم ہونا۔ سپاہیوں کا مجروح ہونا۔ اُن کی درد بھری آہیں اور میدان جنگ میں پڑی ہوئی لاشوں کو جانوروں کا کھانا۔ یہ سب نظارہ اس کی نگاہ کے سامنے ہی سے نہ گزرے تھے بلکہ ان سب میں اس نے نمایاں حصہ لیا تھا اور سپاہی میں کچلی ملاکران کو قلم بند کیا تھا جنگ کے تلخ تجربات حاصل ہو چکے اور ٹالسٹائی دارالخلافہ کو واپس ہوا۔ دوران جنگ میں اس کے متعلق جو اس نے مضامین لکھے تھے انہوں نے تمام مملکت روس میں ایک تہلکہ مچا دیا اور جب وہ دارالخلافہ میں وارد ہوا تو اُس کا بڑا پُرجوش استقبال ہوا۔ روس کے بڑے بڑے اہل قلم نے اس کے سامنے سرنگوں کیا اور ملک کے سربرآوردہ اشخاص نے اس کی خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر جہاں ایک جانب ٹالسٹائی کی یہ عظمت و منزلت تھی وہیں دوسری طرف وہ نہایت بوالہوسی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ شراب خوری۔ تاش۔ جوا اور فاحشہ عورتوں کی صحبت اس کا رات بھر کا شغل تھا اور دن میں مُردوں کی مانند سویا کرتا تھا۔

ان سب فضول خرچیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹالسٹائی نے اپنا خاندانی مکان جس میں اس کی پیدائش ہوئی تھی پانچ ہزار روبل میں بیچ کر قرضہ سے رہائی حاصل کی۔ نفسانی

زندگی کے کافی تجربات حاصل ہو گئے اور اب اس کی طبیعت کا رجحان پھر ایک بار ایک کار آمد اور نیک زندگی بسر کرنے کی طرف ہوا۔ شہری زندگی سے اس کو نفرت ہو گئی۔ دیہات اور اس کے غریب کسانوں کی طرف توجہ مبذول کی اور اس خیال سے کہ غیر ممالک کے طریقہ تعلیم اور میونسپل گورنمنٹ کا تجربہ حاصل کرے۔ اس نے ۱۸۵۷ء میں غیر ممالک کا سفر کیا۔ جرمنی اور اٹلی میں چند ماہ گزار کر پیرس میں آیا۔ یہاں اس نے ایک مجرم کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا اس سے وہ اتنا متاثر ہوا کہ کئی ماہ تک آرام کی نیند نہ سو سکا۔ اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ درد مند شخص لکھتا ہے "میں اپنے دل سے ہی نہیں بلکہ بدن کے ہر جزو سے سمجھ گیا کہ زمانہ حال کا کوئی اصول خواہ وہ کتنے ہی انصاف پر مبنی ہو اس فعل کی حمایت نہیں کر سکتا اور گو پیدائش دنیا سے آج تک بنی نوع انسان نے اس فعل کو کتنا ہی ضروری کیوں نہ تصور کیا ہو میں اس کو غیر ضروری اور خراب سمجھتا ہوں لہذا نیک و بد کا فیصلہ کرنے والا میرا دل اور میں ہوں نہ کہ تہذیب اور ترقی" سفر سے واپس آکر تین برس بیکاری میں گزارے۔ جب ماسکو چلا جاتا تو ناچ اور گانے کی سوسائٹی میں مصروف رہتا اور جب دیہات میں چلا آتا شکار گھوڑے کی سواری اور جسمانی ورزش میں صرف کرتا۔ چال چلن اس زمانہ میں بھی زیادہ بہتر تھا

۱۸۵۹ء میں ٹالسٹائی کی توجہ مسئلہ تعلیم کی طرف رجوع ہوئی اور یہ خیال ذہن نشین ہو گیا کہ روس کی ترقی مسئلہ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہذا ۱۸۶۰ء میں وہاں کا طریقہ تعلیم دیکھنے کے لئے ممالک غیر کا سفر کیا۔ اس سفر میں ٹالسٹائی نے جرمنی، فرانسی اور انگلینڈ کے مشہور کالج اور مدرسہ بغور دیکھے۔ اٹلی اور فرانس کا طریقہ تعلیم پسند نہ آیا۔ جرمنی کی درس گاہوں اور کالجوں کا طریقہ تعلیم کچھ پسند آیا اس لئے انہیں پر اکتفا کی۔ وہاں کے جیل خانوں اور مزدوروں کے مکتب بھی دیکھے۔ بچوں کے لئے کنڈر گارٹن کا جدید طریقہ تعلیم بہت پسند آیا۔ اس سفر میں ٹالسٹائی کا بڑا بھائی نکولس جس کی تندرستی خراب تھی ساتھ تھا۔ اس نے مقام ہرس (Hyres) میں انتقال کیا۔ اس سانحہ کا ٹالسٹائی پر بڑا بھاری اثر ہوا۔

سفر سے واپسی پر گورنمنٹ روس نے اس کو ثالث کا عہدہ پیش کیا اور ٹالسٹائی نے اس کو اس وجہ سے کہ اس میں وہ غریب کسانوں کو مدد کرنے کا ذریعہ دیکھتا تھا خندہ پیشانی سے

قبول کیا۔ اس کام میں ڈیڑھ سال تک اس نے نہایت محنت اور جاں فشانی سے کام کیا۔ یہاں تک کہ صحت خراب ہوگئی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ زمینداروں کے طبقہ میں اس نے اپنے متعدد دشمن پیدا کر لئے۔ اب ٹالسٹائی اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ جدید آزادی کے قانون سے کسانوں کی کوئی ترقی نہ ہوتی۔ اسی زمانہ میں ٹالسٹائی نے اپنے تعلیمی تجربات کو جو اس نے غیر ممالک میں حاصل کئے تھے عمل میں لانا چاہا۔ اور یاسٹا پولیانا اور مفصلات میں متعدد مدرسے جاری کئے اور ایک رسالہ "یاسینا پولیانا" بھی اپنے خیالات کی ترجمانی کے واسطے جاری کیا تعلیم کے متعلق ٹالسٹائی کے انوکھے خیالات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اُستاد کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ بچہ کی رجحان طبع کی پوری نفس شناسی کرے اور جس غذا کی اس کو ضرورت ہو وہی اُس کو دے۔ بچہ کی ساری تعلیم ان سوالات کا جواب ہونا چاہیئے جو قانونِ قدرت نے روزمرہ کے لئے اُس کے اندر قائم کر دیتے ہیں۔

انسانوں کو قدرت نے مکمل پیدا کیا ہے۔ وہ اوائل عمر سے ہی بچوں کو آزاد بنانا چاہتا تھا۔ ٹالسٹائی کی صحت پھر خراب ہوگئی اور وہ صحت حاصل کرنے کے لئے سمارا گیا۔ راستے میں ماسکو میں قیام ہوا اور وہاں ایک شب کی جلسہ بازی کی خاطر اپنی کتاب کاسکس کا حق تالیف ایک سو پونڈ میں فروخت کر دیا۔ اس زمانہ میں ٹالسٹائی کو ڈاکٹر بہرس کی دوسری لڑکی مس سوفیا سے خاص اُنس پیدا ہوگیا۔ موسم بہار ۱۸۶۲ء میں وطن کو واپس ہوا اور ۲۳ ستمبر ۱۸۶۲ء کو مس سوفیا سے شادی ہوگئی۔ لیو ٹالسٹائی اور اس کی دُلہن میں ۱۸ برس کا فرق تھا کیونکہ اُس وقت ٹالسٹائی کی عمر ۳۷ سال کی اور دُلہن کی کل ۱۹ سال کی تھی۔

کاؤنٹس ٹالسٹائی ایک غیر معمولی اوصاف کی عورت تھی۔ اُس میں اپنے قابل خاوند کے دماغی اوصاف موجود تھے۔ وہ محض خانہ داری کے انتظام میں ہی خاوند کا ہاتھ نہیں بٹاتی تھی بلکہ اُس کے تحریری کام میں بھی اس کی پوری پوری مددگار تھی۔ اس نے ٹالسٹائی کی مشہور و معروف تصنیف جنگ و صلح (war and peace) کو سات بار نقل کیا۔ شادی شدہ زندگی کے پچھلے دس سال ہنسی خوشی سے کٹ گئے مگر بقیہ عمر باہمی کشمکش میں کٹی اس دوران میں ان کے ۱۳ بچے ہوئے۔

شادی شدہ زندگی میں داخل ہوتے ہی ٹالسٹائی نے کتاب "جنگ و صلح" لکھنی شروع کی۔ اس کے خاتمہ کے بعد شوپن ہار کی تصانیف پڑھنی شروع کیں اور پانچ بچوں کے لئے ا۔ب۔پ کی کتاب لکھی اور کوہ قاف کا قیدی اور کارنی ویلفس (Horner vosilyef) لکھیں۔ یونانی زبان پڑھنے کا شوق ہوا اور جب بڑی محنت و مشقت کے بعد اتنی استعداد حاصل کی کہ ہومر اور زنوفن پڑھ سکے تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ "مذہب عیسوی کی ۱۹۰۰ سال کی تلقین کے بعد ایسی قوم کے علم و ہنر کی تعریف کرنا جو نیم وحشی تھی غلام رکھتی تھی اور برہنہ جسموں کی تصویر کھینچنے میں اعلیٰ درجہ کی ہوشیاری سمجھتی تھی سخت حماقت ہے۔"

اس دوران میں ٹالسٹائی کی صحت پھر خراب ہوگئی اور صحت حاصل کرنے کے لئے دوبارہ سمارا گیا۔ یہاں لشکیر (Bash Ken) اور ملاچنس (Malchans) نامی دو فرقوں کی زندگی اس کو اتنی پسند آئی کہ اس صوبہ میں اس نے دو ہزار ایکڑ زمین خرید لی۔ ۷۳-۱۸۷۲ء کی قحط سالی میں غریبوں اور بیکسوں کی امداد کے لئے چندہ جمع کیا اور دو لاکھ ستر ہزار پونڈ روپیہ ان میں تقسیم کیا۔ اسی زمانہ میں ایک لیڈی کی خودکشی کا دردناک واقعہ پیش نظر آیا اور اس کی بنا پر مارچ ۱۸۷۳ء میں اپنی مشہور تصنیف اینا کرینا لکھنی شروع کی۔ اس مشہور و معروف ناول میں جو کہ ۱۹ صدی کی سب سے زیادہ قابل تحسین کتاب شمار کی جاتی ہے۔ مصنف نے اس امر کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انسان کا چلن جنم پانے سے لے کر قبر تک یکساں رہتا ہے حالانکہ ٹالسٹائی کی زندگی خود اس امر کی مخالفت میں ایک زندہ ثبوت ہے۔

اینا کرینا ختم ہوچکا تھا اور اس کی اشاعت نے روس اور تمام دنیا میں تہلکہ ڈال دیا مگر یکایک ٹالسٹائی کی زندگی میں ایک بڑا بھاری انقلاب ظہور پذیر ہوا۔ مذہب نے اس کے دل و دماغ پر پورا تسلط قائم کرلیا اور اس روحانی جوش سے بےبس ہوکر وہ اپنے زمانہ کے مذاہب پر حملہ کرنے لگا۔ سارے یورپ میں اس سے اختلاف پیدا ہوگیا۔ خود اس کی اہلیہ اور اس میں اختلاف رائے ہوگیا۔ یہ زمانہ ٹالسٹائی کی زندگی میں ویراگ کا

زمانہ تھا اور اگر سچ پوچھیے تو یہ حالت آخر دم تک قائم رہی۔ گو اس وبراگ کی حالت میں کہیں کہیں روشن ضمیری کی جھلک بھی دکھائی پڑتی ہے۔

ٹالسٹائی ایک عالم گیر مذہب کا پیروکار تھا مگر کیونکہ ایک عیسائی ملک اور خاندان میں پیدا ہوا تھا اس لئے اُس پر عیسائیت کا رنگ زیادہ گہرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ بائبل اور خاص طور پر پُرانے عہد نامہ سے زیادہ بہتر اور مفید کتاب دُنیا میں کوئی نہیں مگر اس کے اعتقادات سادہ تھے اور وہ ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ جس مرد و عورت کے درمیان سب سے پہلے خاوند اور بیوی کا رشتہ قائم ہو جائے وہ تعلق مدام قائم رہنا چاہیئے۔

۲۔ قسم کھانا قطعی ممنوع ہے۔

۳۔ بُرائی کا مقابلہ نہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ اپنے دشمنوں سے محبت کرنی چاہیئے اور جو گالیاں دیں انہیں پیار کرنا چاہیئے۔

۵۔ افلاس اچھی چیز ہے اور دولت مندی و سرمایہ داری گناہ ہے۔

ٹالسٹائی کو کسانوں کو محنت اور سادگی کی زندگی نہایت پسند تھی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ جسمانی محنت اور خدا پر ایمان لانا زندگی کی روحِ رواں ہے۔

ٹالسٹائی کو عالم شباب ہی سے نیچے درجہ کی فاحشہ عورتوں سے سابقہ پڑا تھا اور شادی شدہ زندگی بھی دس سال کے بعد تلخ ثابت ہوئی۔ شاید یہی اسباب ہوں کہ جنہوں نے اس کے دل میں عورتوں کے لئے مخالفت پیدا کر دی۔

پولیٹیکل خیالات نے یہ انتہائی درجہ اختیار کیا کہ وہ گورنمنٹوں کے وجود سے ہی منکر تھا اس کے خیال کے مطابق سب حکومتیں انسان کو نقصان پہنچاتی ہیں اور انسانوں کو آرام سے زندگی بسر کرنے کے لئے ایسے ظالمانہ اور پیچیدہ نظام کی بالکل ضرورت نہیں ہے جس زمانہ میں ٹالسٹائی کے یہ خیالات تھے۔ وہ زمانہ روس میں ایک نہایت ظالم شخصی حکومت کا تھا۔ مگر وہ ایک نڈر آدمی تھا۔ جنوری ۱۹۰۲ء میں اُس نے زار وقت کو

ایک کھلی چھٹی بھیجی جس میں اُس نے لکھا کہ شخصی حکومت اس وقت کے حسب حال تھی جبکہ رعایا بادشاہ کو ایک غلطی نہ کرنے والا دنیوی خدا سمجھتی تھی مگر اب جبکہ وہ یہ بخوبی سمجھ گئی ہے کہ ایک نیک بادشاہ کا ملنا ایک اتفاقیہ امر ہے تو اس حکومت کا قیام ناممکن ہے۔ شخصی حکومت ایک مردہ چیز ہے اور یہ محاصرہ۔ جلاوطنی۔ قتل۔ مذہبی فتوے کتب اور اخبارات کی ضبطی سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ ظالمانہ قانون سے رعایا کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس پر حکومت نہیں ہو سکتی۔ اس زمانہ میں حکومت کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر کام میں خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ تاریک ہو یا روشن۔ رعایا کا کوئی سرپرست بنایا جائے۔ اُس نے صاف الفاظ میں ان خیالات کی تلقین کی کہ بہ رضائے خود یا بہ مجبوری گورنمنٹ کے کسی فعل میں شریک نہ ہونا چاہیئے سپاہی۔ فیلڈ مارشل۔ وزیر ملک۔ کلکٹر ٹیکس۔ گواہ۔ ممبر میونسپلٹی۔ اسسیر۔ گورنر اور ممبر پارلیمنٹ۔ غرضکہ ہر عہدہ سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ نہ ٹیکس کی وصول شدہ رقم سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اپنی جائداد اور دیگر چیزوں کی حفاظت کے لئے گورنمنٹ سے درخواست نہ کرنی چاہیئے بلکہ یہ چیزیں اتنی کم رکھنی چاہئیں کہ دوسرے اشخاص کو اُن کے لینے کا خیال تک بھی نہ ہو۔

وہ کہتا تھا کہ بادشاہ۔ اُس کے رشتہ دار۔ وزیر۔ جج اور پادریوں کو بڑی رقوم دی جاتی ہیں۔ اُن کے عوض میں اُن سے بہت ہلکے کام لئے جاتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگوں کی محنت اور روپے کو چراتے ہیں اور چور ہیں۔ ہم ان لوگوں کو جاگیریں دیتے ہیں جن کو ان کی ضرورت نہیں اور جب مصیبت سے گھرے ہوتے ہیں تماشوں اور دعوتوں میں بے انتہا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ جس ملک میں روحانیت پھیلانے کے لئے پادری بھیجتے ہیں۔ اُس ملک پر چڑھائی کرتے ہیں۔ اس قوم کو غلام بناتے ہیں۔ اس کے سرمایہ کو لوٹتے ہیں اور اس میں بدعادت تمباکو نوشی۔ شراب خوری اور افیون خوری کی بدعتوں کو فروغ دیتے ہیں۔ اُس کے خیال کے مطابق حب الوطنی ایک جاہلانہ۔ نقصان دہ۔ شرمناک اور بری شے ہے اور سکولوں اور کالجوں میں

حب الوطنی غلط تواریخوں کے ذریعہ سے پیدا کی جاتی ہے۔ جن میں لکھا جاتا ہے کہ ہمارا ملک اور قوم سب سے بہتر ہے۔

۲۰۔ نومبر ۱۹۱۵ء کو صبح کے چھ بجے بمقام الستاپوڈو جو ایک دور دراز برفانی خطہ میں واقع ہے ٹالسٹائی نے اپنے قالب عنصری کو الوداع کہا۔ اُس نے چھوٹی بڑی ۶۰ مکمل کتابیں لکھیں اور بہت سے مضامین اور غیر مکمل تصانیف چھپوائیں ٹالسٹائی نہیں رہا مگر اس کا پیغام دنیا میں گونج رہا ہے اور بڑے بڑے تغیر و تبدل پیدا کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں مہاتما گاندھی وہی پیغام زیادہ صحیح اور زوردار طریقہ سے دنیا کو دے رہے ہیں۔ سچائی۔ سادگی اور آزادی اس پیغام کی رُوح رواں ہے۔

ختم شد